جہانِ غالب
10
Ga

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد: پنجم شمارہ_10

نگراں

پروفیسر شمیم حنفی

مدیر

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد: پنجم   شمارہ: 10   جون 2010 تا نومبر 2010ء

قیمت فی شمارہ: -/20 روپے

قیمت سالانہ: -/40 روپے

ڈاک سے: -/50 روپے

کمپوزنگ: شاداب حسین، 2299۔ چھتہ موم گران، بازار چتلی قبر، ترکمان گیٹ، دلی-06

طابع و ناشر

ڈاکٹر عقیل احمد

سکریٹری: غالب اکیڈمی

بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔110013

فون نمبر: 23451098

ای میل: ghalibacademy@rediffmail.com

ویب سائٹ: www.ghalibacademy.org

پرنٹر، پبلشر ڈاکٹر عقیل احمد نے غالب اکیڈمی کی طرف سے ایم آر پرنٹرس 2816 گلی گڑھیا، دریا گنج، نئی دہلی سے چھپوا کر غالب اکیڈمی 168/1 بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی 13 سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: عقیل احمد

فہرست

اس شمارے میں

جہانِ غالب کا دسواں شمارہ پیش خدمت ہے۔ اس شمارے کے بیشتر مضامین غالب اکیڈمی کے سیمینار میں پڑھے گئے مقالے ہیں۔ اس سال مرزا غالب کے ایک سو اکتالیسویں یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے اکتالیسویں یوم تاسیس کے موقع پر سہ روزہ پروگرام 20,21,22 فروری کو منعقد کیا گیا۔ 20رفروری 2010ء کو غالب اور غالب کا عہد کے موضوع پر سیمینار کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں کچھ مقالے غالب اور کچھ غالب کے عہد پر پڑھے گئے تھے اس اعتبار سے یہ شمارہ غالب اور غالب کے عہد کے تعلق سے خصوصی شمارہ بن گیا ہے۔ سیمینار کا افتتاح غالب اکیڈمی کے صدر پروفیسر شمیم حنفی نے کیا تھا۔ اس شمارے کا آغاز بھی ان کی افتتاحی تقریر سے کیا جارہا ہے۔

پروفیسر حنیف نقوی صاحب کا مضمون 'ارشاد حسین خاں' اگر چہ سیمینار میں پڑھا نہیں گیا تھا پھر بھی غالب اور غالب کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں میر ابراہیم علی خاں وفا کے نومولود بیٹے کا نام غالب نے ہی ارشاد حسین تجویز کیا تھا اور ایک رباعی اور قطعہ لکھ کر اکمل الاخبار میں چھپوائے تھے۔ یہ مضمون غالب اور غالب کے عہد کے تعلق سے ایک تحقیقی مضمون ہے۔

پروفیسر عبدالحق کے مضمون کا عنوان غالب کے ایک ممدوح معاصر شاہ غمگین گولیاری ہے۔ جس میں شاہ غمگین گوالیاری سے غالب کے روابط اور غمگین کے شعری کمالات پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون کے آخر میں پروفیسر عبدالحق لکھتے ہیں ''غالب کے معاصرین میں یہ اعزاز وافتخار شاہ غمگین کو حاصل ہے کہ عرض ہنر کے ساتھ عرفان وایقان کی سربلندی میں کوئی ان کا ہمسر ہے اور نہ حریف۔''

پروفیسر قاضی افضال حسین نے اپنے مضمون واقعہ کی تاریخ سازی (1857 کے خصوصی حوالے سے) میں واقعہ، بیان، تاریخ کی تعریف، تشکیل اس کے روایتی اور جدید تصورات کے مطابق 1857 کے واقعے کی تاریخ سازی پر عالمانہ بحث کی ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے اپنے مضمون غالب کی

روش خاص اور سادہ بیانی کا مسئلہ میں مختلف شخصیات کی آرا کے حوالے سے غالب کی مشکل پسندی پر گفتگو کی ہے۔ وسیم احمد سعید نے غالب کے معاصر اور دوست دہلی کی اہم شخصیت مولانا فضل حق خیر آبادی کو اپنے مقالے کا موضوع بنایا۔ مولانا کو انگریزوں نے 1857 کے ہنگامے کے جرم میں کالا پانی کی سزا دی تھی۔ ڈاکٹر ارجمند آرا نے اپنے مضمون میں انگریز ادیبوں میں غالب کے ماہرین میں پروفیسر رالف رسل کی غالب شناسی پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر مسرت جہاں نے اپنے مضمون انقلاب 1857 اور غالب کے خطوط میں 1857 کے تعلق سے غالب کے خطوط کا جائزہ پیش کیا ہے ان خطوط کو سماجی اور انقلابی زندگی کی معتبر دستاویز قرار دیا ہے۔ جاوید رحمانی کے مقالے کا عنوان ہندوستانی فارسی اور اردو گویوں کا تصور استناد اور غالب کا رویہ ہے۔ غالب کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا اس کا اظہار انہوں نے جگہ جگہ کیا۔ غالب ایران کے چند فارسی شعرا کو مستند مانتے تھے۔ جاوید رحمانی نے غالب کے اس نظریے پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی نے اپنے مقالے میں غالب اور عہد غالب کو آج کے ڈرامہ نگاروں کی نظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو غالب کے عہد کو دیکھنے کا ایک نیا انداز ہے۔

1977ء میں جسٹس جاوید اقبال صاحب دہلی تشریف لائے تھے تو جناب خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب سے بھی ملاقات کی تھی اور درگاہ حضرت نظام الدین اور مزار غالب کی زیارت بھی کی تھی۔ جس کا ذکر جسٹس جاوید اقبال صاحب نے اپنی سوانح حیات میں بھی کیا ہے۔ اس لمحے کی یادگار تحریر اور تصویر جناب خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے جہان غالب میں اشاعت کے لئے عنایت فرمائی ان کے شکریہ کے ساتھ جسٹس جاوید اقبال صاحب کی تحریر اور مزار غالب پر ادیبوں کے ساتھ تصویر بھی اس شمارے میں شامل اشاعت ہے۔ آخر میں تبصرے اور بیتے ہوئے چھ ماہی میں اکیڈمی کی سرگرمیوں کی روداد پیش خدمت ہے۔

امید ہے کہ دیگر شمارے کی طرح یہ شمارہ بھی پسند آئے گا۔

☆☆☆

افتتاحی تقریر

ادب اور تاریخ کے رشتوں پر غور وفکر کے سلسلے میں، ادھر خاصی تیزی آئی ہے۔ مورخین میں ادب کو تاریخ کے ایک اہم ماخذ کے طور پر دیکھنے کا چلن بھی عام ہورہا ہے۔ یہ خیال اب زور پکڑنے لگا ہے کہ تاریخ نویسوں کی نظر سے انسانی صورت حال اور اجتماعی زندگی سے وابستہ جو حقائق چھوٹ جاتے ہیں، ادب اور ادیب انہیں نہ صرف یہ کہ اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں، ادب کا دائرۂ کار بھی علوم سے زیادہ وسیع ہے۔ اجتماعی زندگی کی وحدت کی طرح انسانی تجربے کی وحدت کا عکس بھی ہمیں شعر وادب کے آئینے میں زیادہ صاف دکھائی دیتا ہے۔

اس مرتبہ غالب اکیڈمی نے، اسی لئے، اپنے سالانہ مذاکرے کے لئے غالب اور عہد غالب کا موضوع طے کیا تھا اور ایسے اصحاب کو اظہار خیال کی دعوت دی تھی جو ادب کو ایک ہمہ گیر مظہر کے طور پر دیکھتے ہیں اور صرف فنی اور لسانی مباحث کو کافی نہیں سمجھتے۔

بے شک شاعری زبان کی حفاظت کرتی ہے، اس طرح کہ کسی بھی زبان یا معاشرے یا دور کی شاعری میں زبان کے تخلیقی اور تخیلی امکانات جتنے وسیع پیمانے پر روشن کئے جاسکتے ہیں وہ انسانی علم وادراک کی کسی اور سطح پر ممکن نہیں ہے۔ پھر غالب تو ہمارے سب سے بڑے شاعروں میں بھی اپنی وسعت خیال اور اپنی میناکاری، دونوں کے اعتبار سے منفرد ہیں۔ بہ قول صلاح الدین مرحوم اردو کی سب سے اچھی نظم اور سب سے اچھی نثر دونوں کا معیار غالب کی شاعری اور ان کے خطوط کی وساطت سے قائم ہوا۔ ہند اسلامی تخلیقی روایت کا نقطۂ عروج ہمیں غالب کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ وہ صرف اپنے زمانے کے ہی نہیں، اپنی روایت کی بھی سب سے ممتاز تخلیقی شخصیت کہے جاسکتے ہیں۔

میرے استاد، سید احتشام حسین مرحوم نے اپنے دو یادگار مضامین، غالب کی بت شکنی اور غالب اور جدید ذہن، شاید یہی عنوان تھا ان کے دوسرے مضمون کا، ان میں غالب کی شاعری، ان کی تخلیقیت اور ان کے تصورات نیز تجربوں کا ادراک اور تجزیہ غالب اور عہد غالب دونوں کے سیاق میں کیا ہے۔ ان کا

خیال تھا کہ عہد وسطی کی جمالیات، انیسویں صدی کے فکری ماحول اور غالب کے ذہن کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان کے پورے پس منظر کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہماری کلاسیکی روایت کی عظمت اور انفرادیت کا ایک روشن منطقہ غالب کی شاعری ہے، اردو کی ادبی تاریخ میں ایک نئے موڑ کی نشاندہی بھی غالب کی شاعری سے ہوتی ہے۔

غالب ایک عظیم الشان فکری اور تخلیقی روایت کے وارث تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی حیثیت فن اور فکر دونوں کی سطح پر ایک مجتہد کی بھی تھی۔ انہوں نے شاعری کی ایک نئی زبان، انسانی تجربوں کے بیان کا ایک نیا اسلوب وضع کیا۔ اور جہاں تک ان کے عہد کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ انیسویں صدی ہماری قومی تاریخ اور اجتماعی تجربوں کے حساب سے غیر معمولی تاریخی واقعات کی صدی تھی۔ مغلیہ حکومت کے خاتمے اور 1857ء کے قومی سانحے سے قطع نظر، اس صدی نے اقتدار کے دو نظاموں، دو زمانوں، دو تہذیبوں میں اور نئی پرانی دو روایتوں میں آویزش اور آمیزش کا ایک ہولناک، غیر معمولی اور دور رس نتائج کا حامل تماشا بھی دیکھا۔ انیسویں صدی بڑے اور گہرے تصادمات کی صدی تھی۔ تاریخ کے اس دوراہے پر ایک زمانہ اپنی مخصوص روایتوں کے ساتھ رخصت ہو رہا تھا، دوسری طرف ایک نئی روایت قائم ہو رہی تھی اور ایک نیا دور جنم لے رہا تھا۔

غالب اپنے مزاج کے لحاظ سے کلاسیکی بھی تھے، جدید بھی۔ انہوں نے رخصت ہوتی ہوئی زندگی اور روایت کا ماتم بھی کیا اور ہمارے معاشرے میں اپنے قدم جماتی ہوئی نئی زندگی اور روایت کا خیر مقدم بھی کیا۔ وہ تاریخ کی جدلیات اور انسانی ارتقا کے عمل کو بھی اپنے ہم عصر شاعروں اور ادیبوں کی بہ نسبت زیادہ سمجھتے تھے۔ ان کے تمام بالغ نظر معاصرین، سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، آزاد، شیفتہ، صہبائی تاریخ کے اس عجیب و غریب موڑ پر سراسیمہ، پریشان اور ایک حد تک حیران دکھائی دیتے ہیں۔ نیا زمانہ ہماری روایات کے جن نشانات کو مٹانے پر تلا ہوا ہے، ان میں سے کیا کچھ اس لائق ہے کہ اسے بچائے رکھنے کی جدوجہد کی جائے۔ کیا کچھ اپنی وقعت اور افادیت کھو چکا ہے۔ ہمیں کیا کچھ مسترد کرنا ہے اور کیا کچھ قبول کرنا ہے۔ یہ تمام سوالات غالب کی شاعری میں بھی بار بار سر اٹھاتے ہیں۔ غالب یہ بھی کہتے ہیں کہ ؂

پیشِ ایں آئیں کہ دارد روزگار گشتہ آئینِ دگر تقویم پار

اور یہ بھی کہ۔

اسدؔ بزم تماشا میں تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے تو آنکھیں ڈھانپ میں تصویرِ عریاں ہوں

غالب اکیڈمی، یہ ادارہ جس نے غالب کے نام اور کام کو اور ان کے پیغام کو عام کرنے، ان کی تخلیقات کے رمز سے علمی اور ادبی سطح پر پردہ اٹھانے کی ایک مستحکم روایت کی داغ بیل ڈالی، اس کے مرحوم بانی حکیم عبدالحمید صاحب نے غالب کی یاد کو زندہ رکھنے کے سلسلے میں جو اقدامات کیے، وہ کئی اعتبارات سے اہم ہیں۔ غالب اپنی انسان دوستی، اپنی رواداری اور کشادہ فکری کے لحاظ سے، اپنے آفاقی وژن کے لحاظ سے، اپنی ہمہ گیر اور آزادہ رو شخصیت کے لحاظ سے، ہندوستان کے مختلف الجہات اور رنگارنگ معاشرے میں ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ غالب نے دلّی سے محبت کی، اس دیس سے اس دیس کے باسیوں سے محبت کی، اب ان کے شعری اور ادبی کمالات کے سیاق میں، انہیں یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ ہم ان کی قائم کردہ انسانی، فکری، تخلیقی وراثت کا تحفظ کریں اور اسے مزید وسعت دیں۔ غالب اکیڈمی کا یہ مذاکرہ اور سال بہ سال منعقد ہونے والی دوسری تقریبات اسی سمت میں غالب اکیڈمی کے نصب العین اور لائحۂ عمل سے پردہ اٹھاتی ہیں، اس سلسلے میں غالب اکیڈمی کے سکریٹری اور ان کے تمام رفقائے کار ہمارے شکریے کے اور اعتراف کے مستحق ہیں۔ عقیل صاحب نے اس مذاکرے کو زیادہ سے زیادہ بامعنی بنانے کے لئے، جن محترم اور منتخب اصحاب کو شرکت کی دعوت دی تھی، ان میں سے کچھ آئے، کچھ آنے سے رہ گئے۔ ہم تمام آنے والوں کا استقبال کرتے ہیں اور نہ آسکنے والوں سے یہ گزارش کہ وہ ہماری آئندہ تقریب میں شرکت کا وقت نکالیں اور غالب اکیڈمی کی رونق بڑھائیں۔

غالب اکیڈمی ایک عمارت اور ایک تاریخی، علمی اور ادبی مرکز ہی نہیں، دلّی اور دلّی سے باہر کے ادیبوں، ادب دوستوں اور طالب علموں کے لیے غالب اسٹڈیز کے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے کی امین بھی ہے۔ اس حقیقت کا اندازہ آپ کو غالب اکیڈمی کی نئی مطبوعات پر ایک نظر ڈالنے سے ہو سکے گا

اور اکیڈمی کے جریدے 'جہان غالب' کے مشمولات سے بھی، جن میں غالب کی ذہنی اور فن کارانہ عظمت کے آثار کا احاطہ کیا جاتا ہے اور یہ کوشش کہ غالب کے بارے میں کچھ اہم تحریریں اس کے واسطے سے بھی آپ تک پہنچتی رہیں۔ شکریہ۔

پروفیسر شمیم حنفی
صدر، غالب اکیڈمی

☆☆☆

اظہارِ تعزیت

اردو کے بین الاقوامی شہرت یافتہ نقاد، ادیب، ڈرامہ نگار، تخلیق کار پروفیسر محمد حسن اس دارفانی سے 25/اپریل 2010 کو کوچ کر گئے۔ 1926 میں وہ مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی اور اعلی تعلیم کے لئے لکھنؤ چلے گئے۔ لکھنؤ سے پی ایچ ڈی اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ دن لکھنؤ یونیورسٹی میں درس وتدریس اور انگریزی روزنامہ پائنیر میں صحافتی خدمات انجام دیں۔ 1954 میں وہ شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے۔ 1964 میں شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں ریڈر ہوگئے۔ 1972 میں کشمیر یونیورسٹی میں انہیں پروفیسر اور شعبہ اردو کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ 1975 میں دہلی آگئے اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز سے وابستہ ہوگئے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں اردو شعبے کے آپ بانی پروفیسر ہیں۔ انہوں نے اردو کا پہلا ماس میڈیا کورس شروع کیا۔ رٹائرمنٹ کے بعد پروفیسر محمد حسن کو پروفیسر ایمریٹس کا اعزاز دیا گیا۔ 1989 سے 1994 تک مرحوم غالب اکیڈمی کے منصوبہ تحقیق اصطلاحات اور ہندوستانی پروجیکٹ سے وابستہ رہے۔ یہاں انہوں نے An altimate link language for South West Asia، ہندوستانی شاعری اور ہندوستانی محاورے کی تدوین کا کام بھی کیا۔ ان کی اہم تصانیف دہلی میں اردو شاعری کا فکری وتہذیبی پس منظر، رومانوی تحریک، عرض ہنر، اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ، ادبی تنقید، ادبی سماجیات جو تنقید میں عالمی شہرت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا شعری مجموعہ زنجیر نغمہ، مجاز پر ایک ناول، ڈرامہ ضحاک اور دیگر تصانیف اردو کا گراں مایہ سرمایہ ہیں۔

غالب اکیڈمی کی گورننگ کونسل اور جنرل باڈی کے جلسے میں پروفیسر محمد حسن کے انتقال پُر ملال پر تعزیت کا اظہار کیا گیا اور اللہ سے دعا کی گئی کہ انہیں جنت الفردوس میں اعلی مقام حاصل ہو۔

☆☆☆

پروفیسر حنیف نقوی

ارشاد حسین خاں

ارشاد حسین خاں تاریخی نام ہے جو مرزا غالب نے سنہ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں میر ابراہیم علی خاں وفا کے نومولود بیٹے کے لئے تجویز کیا تھا۔ جولائی سنہ ۱۸۶۸ء میں حکیم سید احمد حسن مودودی کے خط سے انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ ''نواب صاحب قبلہ کے ہاں اس مہینے میں لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔'' اس کے جواب میں غالب نے حکیم صاحب کو لکھا تھا کہ ''مجھ کو تاریخ تولد کا خیال رہے گا۔ جب آپ کی تحریر سے نوید تولد معلوم کرلوں گا تب قطعہ یا رباعی جو کچھ ہوگی، وہ بھیج دوں گا۔'' کچھ دنوں کے بعد جب حکیم صاحب کے خط سے غالب کو متوقع 'نوید تولد' ملی تو انہوں نے میر ابراہیم علی خاں صاحب کی خدمت میں ہدیۂ مبارک باد پیش کرتے ہوئے لکھا:

> ''حضرت سید احمد حسن خاں صاحب مدظلہ العالی کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ کے گھر مولود مسعود پیدا ہوا۔ ایک عبارت رنگین مرتب کر کے اکمل الاخبار میں میں نے چھپوا دی ہے اور ایک رباعی اور ایک قطعہ اپنا اور ایک قطعہ سید صاحب ممدوح کا جو انہوں نے یہاں بھیجا تھا، وہ بھی چھپوا دیا اور تین قطعے تاریخ بہاری لال منتظم اور میر فخر الدین مہتمم مطبع نے جو یہاں تاریخیں لکھی تھیں، وہ چھپوا دیے، چنانچہ اپنی لکھی ہوئی رباعی اور قطعہ عرض کرتا ہوں۔ رباعی:''

حق داد بہ سید ز پے انعامش　　فرخ پسرے کہ واجب است اکرامش
تاریخ ولادتش بود بے کم و بیش　　'ارشاد حسین خاں' کہ باشد نامش

۱۲۸۵ھ

قطعہ

غالب حال سنین ہجری　معلوم کن از 'خجستہ فرزند'

چوں یک صدو بست وچار ماند　این است شمار عمر دل بند

''یہ تو ظاہر ہے کہ سنہ ۱۲۸۵ھ ہے۔ جب 'خجستہ فرزند' کے اعداد میں سے ۱۲۸۵ لے لیے جائیں تو ایک سو چوبیس بچتے ہیں۔ ان کو میں نے دعاے عمر نو مولود قرار دیا۔ حق تعالی اس مولود کو تمہارے سامنے عمر طبیعی کو پہنچائے۔''

اس خط کے مطابق غالب نے جو 'عبارت رنگیں' مرتب کر کے 'اکمل الاخبار' میں اشاعت کے لئے بھیجی تھی، وہ حسب ذیل ہے:

''بہ فضل الہی ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۵ھ کو روز یک شنبہ، گھنٹہ بھر دن رہے جناب معلی القاب نواب میر ابراہیم علی خاں بہادر رئیس اعظم سورت کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ گویا نواب صاحب چاند تھے اور یہ چاند کے پاس ایک روشن ستارہ چمکا۔ حق تعالی اس ماہ رخشندہ و اختر تابندہ کو اوج عزت واقبال پر تا طلوع آفتاب قیامت پر نور وضیا گستر رکھے۔ جناب مستطاب نجم الدولہ نواب اسد اللہ خاں بہادر مدظلہم نے ایک رباعی اور ایک قطعہ تہنیت نئی طرز کا کہ دیکھنے والے بہ شرط دید وفہمید اس کا لطف اٹھائیں گے، ارشاد فرمایا ہے۔ ہم بہ غرض افزائش رونق اخبار رباعی وقطعہ لکھتے ہیں۔''

یہ عبارت 'اکمل الاخبار' کے ۲ ستمبر ۱۸۶۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ چونکہ از روئے قاعدہ اسے مہتمم اخبار کی طرف سے بہ طور خبر شائع ہونا تھا، اس لئے غالب نے مقتضائے حال کے مطابق اس میں اپنا ذکر بہ صیغہ غائب کیا ہے۔ تحقیقی اعتبار سے اس خبر کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے ارشاد حسین خاں کی تاریخ ولادت کا تعین ہو جاتا ہے۔ تقویم ہجری کے مطابق یہ تاریخ ۲۶ ربیع الآخر سنہ ۱۲۸۵ھ یوم یک شنبہ ہے جو سنہ عیسوی کے حساب سے ۱۶ اگست ۱۸۶۸ء کے مطابق قرار پاتی ہے۔

جیسا کہ غالب کے محولہ بالا خط سے معلوم ہوتا ہے، انہوں نے اس موقعے پر ایک رباعی اور ایک قطعہ کہہ کر بہ طور تہنیت میر ابراہیم علی خاں کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ یہ دونوں منظومات ان کے

آخری مجموعہ نظم ونثر 'باغ دودر' کے حصہ اول میں 'قطعات' اور 'رباعیات' کے ذیلی عنوانات کے تحت علیحدہ علیحدہ منقول ہیں۔ قطعے کا نمبر ۴۳ اور رباعی کا نمبر ۲۰ ہے۔ لیکن اس مجموعے میں اس واقعے سے متعلق ایک اور قطعہ بھی موجود ہے جو غالباً بعد میں کہا گیا ہوگا۔ یہ قطعہ جو چوالیسویں نمبر پر درج ہے، رباعی کی بحر میں ہے اور اس میں بہ یک وقت ہجری اور عیسوی دونوں سنوں کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ ہجری مادۂ تاریخ اول الذکر رباعی اور اس قطعے میں مشترک ہے یعنی یہاں بھی مجوزہ تاریخی نام ہی کو بہ طور مادۂ تاریخ اول الذکر رباعی اور اس قطعے میں مشترک ہے یعنی یہاں بھی مجوزہ تاریخی نام ہی کو بہ طور مادۂ تاریخ نظم کردیا گیا ہے۔ قطعہ یہ ہے:

در بارۂ اسم و سال مولود سعید — رفتست ز غالب سخنور توضیح

'ارشاد حسین خاں' سنین ہجریست — بنگر کہ 'خجستہ رخ' بود سال مسیح

۱۲۸۵ھ — ۱۸۶۸ء

غالب نے اپنے خط میں اپنی ایک رباعی اور ایک قطعے کے ساتھ احمد حسن خاں صاحب کے بھیجے ہوئے ایک قطعے کے بھی چھپوادینے کا ذکر کیا ہے۔ 'فی الوقت' اکمل الاخبار' کے حوالے سے اس قطعے تک پہنچنے کے امکانات مفقود ہیں، البتہ 'سید صاحب ممدوح' کے دیوان کے مطالعے سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ انہوں نے اس موقعے پر دو قطعات تاریخ کہے تھے جو 'تاریخ تولد میر احتشام علی خاں طال عمرہ پسر میر ابراہیم علی خاں صاحب دام اقبالہ'' کے زیر عنوان اس دیوان کے صفحہ ۶۵ پر درج ہیں۔ ان میں سے پہلا قطعہ یہ ہے:

شد تولد چو احتشام علی — کز معلم میا و تو بخش

از رخش عیانست فضل و ہنر — 'مظہر علم' گشت تاریخش

'مظہر علم' سے سنہ ۱۲۸۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ غالب کے مستخرجہ مادہ ہائے تاریخ بھی اسی ہجری سنہ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ارشاد حسین خاں اور میر احتشام علی خاں دونوں ایک ہی شخص کے نام ہیں۔ بہ الفاظ دیگر غالب نے جس نومولد کے لئے ارشاد حسین خاں بہ طور

اسم تاریخی تجویز کیا تھا، وہ اپنے والدین یا بزرگوں کے فیصلے کے مطابق میر احتشام علی کے نام سے موسوم ہوا۔ لالہ سری رام نے اور ان کے اتباع میں مالک رام نے میر احتشام علی خاں کی تاریخ ولادت ۱۵ ربیع الثانی سنہ ۱۳۲۵ھ تحریر کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اطلاع درست نہیں۔

ارشاد حسین خاں معروف بہ میر احتشام علی خاں کی ولادت اور اسم تاریخی کی طرح ان کی شادی کا واقعہ بھی غالبیات کے سلسلے کا ایک قابل ذکر حوالہ ہے۔ غالب نے حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام اپنے ۲۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کے خط میں ان سے یہ سوال کیا تھا:

> ''آگے اس راج (بڑودہ) میں حسام الدین حسین خاں اور شرف الدین حسین خاں بڑے معزز اور مکرم متوسل تھے اور سیر حاصل جاگیریں رکھتے تھے۔ کیا سید ابراہیم علی خاں صاحب اسی خاندان سے ہیں؟''

سید ابراہیم علی خاں نوابان بڑودہ کے اس خاندان سے تو نہ تھے لیکن ان دونوں خاندانوں کے درمیان باہمی روابط ضرور موجود تھے اور بعد میں فی مابین قرابت داریاں بھی قائم ہوئیں۔ چنانچہ ابراہیم علی خاں کی حقیقی پھوپی زاد بہن امت النساعرف محمدی بیگم حسام الدین حسین خاں کے صاب زادے سید کمال الدین حسین سے منسوب ہوئیں۔ حکیم سید احمد حسن مودودی کے متخرجہ مادۂ تاریخی 'نصیب باد ترا با کمال عیش دوام' کے مطابق یہ شادی سنہ ۱۲۸۵ھ (۶۹-۱۸۶۸ء) میں ہوئی تھی۔ ان دونوں خاندانوں کے درمیان یہ غالباً پہلا رشتہ مناکحت تھا۔ اس کے بعد میر احتشام علی خاں کی شادی بھی اسی خاندان میں سید کمال الدین حسین کے برادر حقیقی سید نور الدین حسین کی صاحب زادی امینہ بیگم سے ہوئی۔ اس تقریب کا انعقاد ۲۴ر جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۰۴ھ (۲۰ر مارچ سنہ ۱۸۸۷ء) کو ہوا تھا۔ اس شادی کا دعوت نامہ جو میر ابراہیم علی خاں نے یکم جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۰۴ھ (۲۵ر فروری ۱۸۸۷ء) کو اپنے دستخط سے میرے نانا منشی شاکر حسین نکہت سہوانی (پ: ۲۹ر جوان ۱۸۷۱ء، ف: ۲۳ر دسمبر ۱۹۵۲ء) کے نام ارسال کیا تھا، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے ذخیرہ نوادر میں محفوظ ہے۔ اس دعوت نامے سے مالک رام، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور میر جعفر امام کے اس خیال کی تردید

ہو جاتی ہے کہ میر ابراہیم علی خاں سنہ ۱۸۸۵ء میں فوت ہو چکے تھے۔

اپنے والد اور دادا (میر اکبر علی خاں) کی طرح میر احتشام علی خاں کا شمار بھی بڑودہ کے درجہ اول کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ ریاست و وجاہت کی طرح شاعری بھی آپ کو اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ جادو تخلص کرتے تھے۔ شروع میں کچھ دنوں تک والد ہی کو اپنا کلام دکھایا۔ بعد ازاں برسوں تک مولانا نجم الدین ثاقب بدایونی، (پ: ۱۸۶۸ء، ف: ۱۹۴۵ء) شاگرد داغ (پ: ۱۸۳۱ء، ف: ۱۹۰۵ء) سے جو آپ کے مصاحبین میں شامل تھے، مشورۂ سخن کرتے رہے۔ ثاقب اسی مصاحبت کے زمانے میں آپ ہی کے کسی کام سے ٹونک گئے تو انہوں نے وہاں ظہیر دہلوی (پ: ۱۸۲۵ء، ف: ۱۹۱۱ء) سے اپنے کلام پر اصلاح لے کر ان کے شاگردوں میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس کے بعد جادو نے بھی لالہ سری رام کے بقول 'تیمناً و تبرکاً چند غزلیں ان کی خدمت میں پیش کیں۔'' دیوان مرتب تھا مگر شائع نہیں ہو سکا۔ ۱۵ ربیع الآخر سنہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۲۸ مئی سنہ ۱۹۰۷ء کو جب کہ آپ بہ حساب سنہ عیسوی اپنی عمر کے انتالیسویں سال میں تھے، بڑودے ہی میں آپ کی وفات ہوئی۔

مآخذ

۱۔ باغ دودر، مرتبہ ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی، شائع کردہ اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۰ء

۲۔ تذکرۂ ماہ و سال، از مالک رام، شائع کردہ مکتبہ جامع، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء

۳۔ تلامذۂ غالب، از مالک رام شائع کردہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء

۴۔ خزینۃ الانساب، از ابو العلا سید نظیر احمد افسوں، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، ۱۹۵۹ء

۵۔ خم خانہ جاوید، از لالہ سری رام، جلد دوم، مطبوعہ ۱۹۱۱ء

۶۔ دیوان فدا، مرتبہ سید واجد حسین، مطبوعہ عثمانی پریس، مدراس، ۱۹۷۹ء

۷۔ سخنوران گجرات، از ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، شائع کردہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء

۸۔ غالب۔ احوال و آثار، از حنیف نقوی، شائع کردہ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء

۹۔ غالب کے خطوط، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، جلد سوم، شائع کردہ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء

۱۰۔ Ghalib And The Mirs of Gujrat, by Mr. Jaffar Imam, Rupa Co. Delhi, 2003

پروفیسر عبدالحق

غالب کے ایک ممدوح معاصر۔شاہ غمگین گوالیاری

شعری تاریخ کے تقریباً ہر دور میں نشاط وطرب کے ساتھ تذکرو تزکیہ کے تصورات کارفرما رہے ہیں۔ابتدائی دور میں شاہ حاتم ترجمان تھے۔دوسرے دور کی نمائندگی خواجہ میر درد کے سپرد تھی۔اس کے بعد سرنوشت شاہ غمگین کی لوحِ جبیں پر لکھی گئی۔عہد غالب کی کیفیت کہکشاں جیسی ہے۔زبان واظہار کے اسالیب کی پختگی کا فطری نتیجہ تھا کہ سخن وری ہم سایہ آسمان اور آئینہ شش جہت کی تمثال بن گئی۔ غالب کے لفظوں میں یہ عہد گل ہے۔پرسیول اسپیر کا استعجاب پیش نظر ہو تو اعتراف کرنا پڑے گا کہ سیاسی سراسیمگی اور انحطاط کی عمومی فضا میں تخلیقی ثروت اور اس کی سرفرازی معجزات فن میں شمار کی جاسکتی ہے۔

میر سید علی غمگین معاصرین میں اسالیب وآہنگ کے اعتبار سے نمایاں مقدور کے مالک تھے۔وہ سواد اعظم کے دور گوالیار میں مقیم اور گوشہ گیر تھے۔انہوں نے عظیم آباد کا سفر بھی کیا اور مقامی شعراء سے مراسم بھی قائم کئے۔وہ بھی دل داری کی حد تک۔ان کے مزاج میں نہ جاہ طلبی تھی اور نہ داد سخن کی خواہش۔وہ زندگی میں بے نیازی اور بود وباش میں سادگی کے پیکر تھے۔خاک وخمیر میں درویشی وقلندری کے اجزا ہم آمیز تھے۔ ہر اقتدار کے آستانے سے دور رہے اس کے برعکس معاصرین کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی نے انہیں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل چلنے کے لئے مجبور کیا جس سے بے رشک ورقابت اور حریفانہ کشاکش نے جنم لیا۔قصیدے کے صنف نے فروغ پایا۔مگر فن کاروں کی توقیر وتمکنت پر حرف آیا۔وہ کذب وکتمان کے بار گراں سے نہ سبک دوش ہو سکے اور نہ محفوظ ہی رہے۔شاہ غمگین کو آفریں ہو کہ انہوں نے قلم کی حرمت کا پاس رکھا اور قصیدے کے قریب سے بھی نہ گذرے۔دو مجموعے منظر عام پر آئے۔'مخزن اسرار' میں صرف غزلیں ہیں۔جن کی تعداد تقریباً آٹھ سو ہے۔'مکاشفات الاسرار' اٹھارہ سو رباعیوں پر مشتمل ہے۔چند مخمسات اور قطعات تاریخ بھی تخلیق کئے۔مگر ان کا سرمایہ شعری مدح

معشوق کے لئے مخصوص تھا۔ ہست معشوقے سزاوار غزل۔ وہ کسی ممدوح کا ثناخواں نہ بن سکا۔ معاش و معیشت سے یہ استغنا درویشی میں امیری کے آداب سکھاتا ہے اور عرض ہنر کے جوہر آشکار کرتا ہے۔ پوری زندگی بے منت غیر گزری۔ جب کہ دوسرے پیران سخن داد و دہش کے لئے در بدر سرگرداں رہے۔ مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کے خلعت وزرا اور نواب ٹونک کے عطیے کی پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ نواب کے اصرار پر کثیر رقم میں سے صرف ساٹھ روپے ماہانہ لینے پر آمادہ ہوئے۔ استاذ الاسناد شاہ حاتم دہلوی کی طرح مزاج میں آزادی و درویشی کا غلبہ تھا۔ انہیں کی طرح سپہ گری و شہ سواری سے شوق رکھتے تھے۔

اے قدرداں کمال حاتم دیکھ　　عاشق و شاعر و سپاہی ہے

یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ شاہ حاتم کے شجرۂ شاگردی میں باکمالوں کا جو سلسلہ ہے وہ دوسرے شعری نسب ناموں میں نظر نہیں آتا۔ سودا، رنگین، غمگین کے موثرات آج بھی مشاہدہ میں ہیں۔ فیض نے بھی 'نذر سودا' کو ہی قابل اعتنا سمجھا۔ حاتم کی خوش باشی و بے نیازی، دل بری و دل داری کی روایت شاہ غمگین تک محسوس کی جاسکتی ہے۔ 'عیار الشعراء' کے مصنف خوب چند ذکا نے لکھا ہے:

''جوان گرم اختلاط و خوش خلق و شگفتہ بیان، سعادت آثار، ستودہ اطور، یار باش پُر حلم و حیا معلوم شد۔''

'مجموعہ نغز' کے مولف قدرۃ اللہ قاسم کے بھی کم و بیش یہی تاثرات ہیں۔

''جوانے نیک زندگانی، کشادہ پیشانی، خوش اختلاط، مستحکم ارتباط، یار باش، محبت تلاش، مخلص نواز، مخالف گداز، باعز و تمکین شاگردِ سعادت یار خاں رنگین است۔''

شروع کے تقریباً تیس سال بے فکری اور آلام روزگار سے نا آشنائی میں گزرے۔ معاً ایک قلبی واردات سے دوچار ہوئے اور اسلوب زندگی میں انقلاب برپا ہوا۔ ذکر و فکر کے ساتھ نالہ نیم شبی نے تلاطم پیدا کیا۔ ۲۹ رسال کی عمر میں سید فتح علی حسینی گردیزی کے مرید ہوئے۔ یہ سلسلہ قادریہ سے وابستہ تھے۔ سلوک و معرفت کی منزلیں آسان ہوگئیں۔ شعر و شاعری سے وہ دلچسپی برقرار نہ رہی۔ عظیم آباد کے

سفر میں شاہ ابوالبرکات کی ہدایت پر تخلیق کی طرف متوجہ ہوئے۔

غمگین سادات میں تھے۔ ان کے اجداد بغداد سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے اور برہان پور میں آباد ہوئے۔ ان کے والد اور چچا شاہ عالم ثانی بادشاہ کے دامن دولت سے وابستہ وزیر اور نائب وزیر کی خدمت پر مامور تھے۔ شاہ غمگین سے بھی امراء وشہزادگان کے قریبی مراسم تھے۔ مسند ارشاد بھی بچی رہتی کئی مقتدر حضرات بیعت سے بھی سرفراز ہوئے۔ کئی خلفاء اس سلسلہ ہدایت کو فروغ دیتے رہے۔

دوسری جانب شاعری میں شاہ نصیر مشورہ واستفادہ کے لئے غمگین سے رجوع کرتے رہے۔ شاہ نصیر ذوق اور بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ تذکرہ نگاروں نے نواب الٰہی بخش معروف اور غالب کو بھی اصلاح ومشورہ لینے والوں کے کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ آب حیات کی روایت کو عبدالشکور اور محمد سعود وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے۔ غالب نے تو خطوط میں اپنی لسانی ارادت کا ذکر بھی کیا ہے اور شاہ غمگین کا اخلاص دیکھئے کہ انہوں نے رباعیات کے مجموعہ 'مکاشفات الاسرار' کو غالب کے نام ممنون کیا ہے۔ غالب کے نام غالباً یہ پہلا انتساب ہے۔ جسے غالب سعادت وشرف سمجھتے رہے۔

غمگین اور غالب کے فارسی خطوط میں اس بارے میں کافی روشنی موجود ہے۔ جو ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے شائع کئے ہیں۔ پنج آہنگ کا حسب ذیل شعر غالب کی ارادت مندی کا اظہار ہے۔

در دل بہ تمنائے قدم بوس تو شوریست   شوقت چہ نمک دادہ مذاقِ ادبم را

غالب کی انا پسند طبیعت کی یہ گہری عقیدت بے سبب بھی نہیں ایک خط کے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

''می میرم از رشک کہ دیگراں آہنگ راہ گوالیار دارند و مرا ہنگام آں نیامدہ است کہ از دام بدر توانم جست، یارب زود باشد کہ کام دل برآید و زمانِ انتظار حکم ولایت روزگار ہجراں بسر آید۔''

غمگین نے 'مکاشفات الاسرار' کے انتساب کی اجازت چاہی تو غالب نے بصد احترام لکھا۔

''قبلہ گاہا! فضولی میکنم و چوں فرمان چنیں است می گویم کہ گنجیدن نام دراں نامہ نہ تنہا از

بہر من بلکہ از بہر آبائے من سرمایۂ نازش جاودانی است۔''

یہ خطوط پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مرحوم نے اردوئے معلّٰی کے شمارہ دوم میں (مطبوعہ ۱۹۶۱ء) میں شائع کئے ہیں۔ غالب کو جب دونوں کتابیں مخزنِ اسرار اور مکاشف الاسرار موصول ہوئیں تو غالب کا ایک جملہ سنیں جو رسید اور تاثر مطالعہ کے طور پر لکھا گیا تھا:

''آن چہ در دیوان فیض عنوان دیدہ کافر باشم اگر در مثنوی مولوی روم و دیگر کتب تصوف دیدہ باشم۔ خاصہ در رباعیات کہ ہر گوزہ دریاے دہر آفتابے دار دو اگر حیات باقی است زیں پس حال رباعیات نگاشتہ خواہد شد۔''

اصلاح وستایش کی یہ باتیں یک طرفہ نہ تھیں۔ شاہ صاحب بھی کبھی کبھی اپنا کلام بھیجتے۔ اصلاح چاہتے اور داد بھی طلب کرتے۔ وسعت نظر دیکھیے کہ اپنے دیوان میں جابہ جا کلام غالب کے اعتراف کا اظہار کرتے ہیں:

بہت سی سیر دوا دین ہم نے کی غمگین مگر اسد کے نہیں انتخاب سے نسبت

غالب کے انتخاب کو جو دیکھے غور سے دیواں سے اپنے کیا وہ کرے انتخاب پھر

ایک غالب پر موقوف نہیں۔ غمگین کا آستانہ مرجع خلائق تھا تو دوسری طرف وہ سخن سنجی اور فن کی سیرابی کے رود رواں تھے۔ وہ بہ ظاہر سواد اعظم سے کوسوں دور تھے۔ مگر دہلی کے اہل نظر متواتر فیضیاب ہوتے رہے۔

ان کی جاے پیدائش دہلی تھی۔ ان کے اجداد کا تعلق مشہور بزرگ خواجہ باقی باللہ کے گھرانے سے تھا۔ ابتدائی زندگی دہلی میں ہی گزری۔ زیادہ تعلیم نہ حاصل کرسکے کیونکہ باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چچا نے پرورش کی اور ناز برداری بھی۔ گوالیار میں قدم رکھا اور وہیں کے ہو رہے۔ اس سرزمین کو کشف و مجاہدات سے معتبر کیا تو دوسری طرف شعر و سخن کی محفلوں کو تخلیقی تاب کاری بخش دی۔ دارالخلافہ سے دور رہ کر ادب کی آبیاری میں ان کے نقش و نگار لافانی ہیں۔ انہیں کوئی بجنوری یا عرشی نہ مل سکا۔ نہ ہی مومن، ذوق و نصیر کی طرح ضیا و تنویر ملے۔ غمگین کا کلام ہنوز کسی مردافگن عشق کا منتظر ہے۔ ان کے کلام کی تدوین

نہ ہوسکی۔ فیصل آباد کے لائق استاد محترم ڈاکٹر زمرد کوثر نے یہ کام انجام دیا ہے۔ جو ابھی شائع نہیں ہوسکا ہے۔

ان کی یکتائی و انفرادیت دیکھئے کہ اٹھارہ سو رباعیوں کا مجموعہ پیش کیا۔ میرے استاد ڈاکٹر سلام سندیلوی مرحوم کے بقول اردو میں رباعی سمجھنے کی یہ تنہا مثال ہے۔ غیرت نفس دیکھئے کہ افرنگیوں کی اطاعت پسند خاطر نہ تھی۔ دہلی میں رہنا گوارا نہ کیا۔ گوالیار چلے گئے۔ کیونکہ دہلی میں فرنگیوں کا عمل دخل حد سے تجاوز کررہا تھا۔ ان کے لئے غمگین کے ہاں ایک نفرت آمیز رویہ پرورش پارہا تھا۔ وصیت نامہ کی یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

''ایں کہ گاہے نوکر فرنگی نکنند، اگر از بہم نہ رسیدن نان جان بہ لب آمدہ باشد نوکری کفار فرنگ نکنند۔''

مردِ صفا کی یہ مجاہدانہ روشن ضمیری قابل احترام ہے۔ اس دور کے اکابرین تصوف اور دانش و بینش کے نگہبانوں کے قدم ڈگمگا چکے تھے۔ شاعران زماں بھی احساس زیاں سے محروم تھے۔ ہاں مومن کو آفریں کہتا ہوں کہ مثنوی جہاد رقم کرکے عزم جواں کا ثبوت دیا۔ سعادت یار خاں رنگین بھی سلطان ٹیپو شہید کی شان میں قصیدہ اور انگریزوں کی تحقیر کرچکے تھے۔ جس کی پاداش میں مولانا محمد حسین آزاد نے ریختی کا شاعر کہہ کر اس عبقری کو ادبی انصاف سے محروم کردیا۔ رنگین کی یہ وراثت شاگرد رشید حضرت غمگین کے مقدر کا حصہ بنی۔

شاہ غمگین کے سنہ پیدائش کے بارے میں تقریباً سبھی تذکرے خاموش ہیں۔ بیشتر محققین اور نقادوں نے ۱۱۶۷ھ یا ۱۷۵۳ء پر اتفاق کیا ہے۔ فکر و تحقیق کے گذشتہ شمارہ دسمبر ۲۰۰۹ء میں گوالیار کے وقار صدیقی نے بھی یہی تاریخ لکھی ہے۔ شاہ صاحب کے بیٹے عبدالرزاق نے 'وظیفہ شریف' میں بھی یہی درج کیا ہے۔ راقم کے نزدیک یہ تاریخ مشتبہ ہے کیونکہ غمگین نے مکاشفات الاسرار کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ 'عمر بہ شصت سالگی رسیدہ' ساٹھ سال کی عمر میں یہ دیوان رباعیات ترتیب دیا۔ اگر ۱۷۵۳ کی روایت تسلیم کی جائے تو ان کی عمر ترتیب کے وقت ۸۸ برس کی ہوتی ہے۔ ایک اور بھی شہادت ہے جو

خواب سے متعلق ہے۔وہ ۱۱۹۵ھ یعنی ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۱ء میں وفات پائی۔صدق و یقین کا یہ پیکر پچاس سال تک خلق خدا اور علم وادب کی خدمت انجام دیتا رہا۔ان کا کلام ان کی فکر ونظر کا آئینہ خانہ ہے۔جس میں اعلی اقدار زندگی کو اولیت حاصل ہے۔نوع انساں کے سوز وساز سے ان کی شاعری پُرنور ہے۔منزہ خیالات کی تطہیر اور تشہیر ان کا نصب العین تھا۔

دل کی رکھا اپنے خبر دل کو کسی کے نہ دکھا   اور کا درد نہ ہو جس کو وہ انسان نہیں

نہ کام مال سے مطلب نہ کچھ خزینے سے   جو خاص بندے ہیں اس کے انہیں سوا اس کے

جس جگہ بیٹھ گئے ہم وہ جہاں اپنا ہے   اٹھ گیا دل سے تعین تو جہاں اپنا ہے

شاہ حاتم نے زبان واسالیب کے بدلتے ہوئے رجحان کے مطابق قدیم دیوان سے ایک نیا انتخاب کیا اور لسانی تبدیلی بھی کی تھی۔شاہ غمگین نے بھی ساٹھ سال کی عمر میں معرفت کے حصول کے بعد سابق زمانے کے کلام کو دور کیا۔علم وعرفان پر اساس رکھی۔

ان کا کلام معرفت الٰہی اور معشوق مجازی وحقیقی سے معمور ہے۔ابتدائی دور میں حسن وعشق کے اضطراب پیہم کا ذکر کثرت اور کیفیت کے اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔مگر سلوک کی رہ نوردی کے بعد وہ گریزاں ہوئے اور مضامین نو کی طرف مراجعت نے علم وعرفان کی ایک دنیائے بے کراں سے روشناس کیا۔فکر وشعر میں آہنگ واسلوب کا یہ تغیر تنقید کی ہر تعبیر سے بالاتر ہے اور تادیل سے ماورا بھی۔حقیقت کی دریابی کے لئے شاہ غمگین کے نور وسرور کا فیضان درکار ہے۔اسی لئے انہوں نے عارفانہ رباعیوں کی اسرار کشائی کے لئے طویل شرح بھی لکھی۔

مختلف تذکروں کے علاوہ ان کے شعری مجموعوں اور معاصرین کی بیاضوں سے آثار تک رسائی ممکن ہے ان کے بارے میں تفصیلات جمع کرنا آسان نہیں۔۔ابھی یہ کام تشنہ تکمیل ہے اور جاں طلب بھی۔اب تک کی اطلاع کے مطابق پانچ قلمی نسخوں کا سراغ مل سکا ہے۔بنارس کا نسخہ خاصا اہم ہے۔برٹش میوزیم

کا بھی۔ باقی خطی نسخے پاکستان میں محفوظ ہیں۔ شاہ غمگین کی چودہ قلمی کتابوں کے مسودوں کی بھی نشان دہی کی جاچکی ہے۔ چند کے حسب ذیل نام ہیں۔

مراۃ الحقیقت، کلمات قدسیہ، وظیفہ شریف، کشف الانوار، اسرار الصلوۃ، سرالمصحف، المیح القلوب، حقیقت خلافت، شش کلمے، حقیقت الایمان وغیرہ۔

یہ ان کے متصوفانہ مشاہدات کے آثار ہیں جن میں علمی و مذہبی موضوعات کو احسن طریقے پر پیش کیا گیا ہے۔ غالب کے معاصرین میں یہ اعزاز وافتخار صرف شاہ غمگین کو حاصل ہے کہ عرض ہنر کے ساتھ عرفان وایقان کی سربلندی میں کوئی ان کا ہمسر ہے اور نہ حریف۔

☆☆☆

پروفیسر قاضی افضال حسین

واقعہ کی تاریخ سازی

(۱۸۵۷ کے خصوصی حوالے سے)

واقعہ اور اس سے مرتب ہونے والی تاریخ کے درمیان بیانیہ (Narration) حائل ہے۔ یعنی واقعہ، تاریخ نہیں ہوتا، واقعے کا 'بیان' تاریخ کہلاتی ہے اور 'بیان' کے اپنے تقاضے اور مسائل ہیں۔ جو اس کی شناخت اور حدود متعین کرتے ہیں، پہلی بات تو یہ کہ بیانیہ کی اپنی ایک ہیئت ہوتی ہے اس اعتبار سے کہ بیانیہ کا ایک موضوع ہوتا ہے جو واقعہ Record کرنے والی دوسری ہیئتوں مثلاً ڈائری، وقائع، روزنامچہ، سفرنامے یا خطوط کا نہیں ہوتا۔ مثلاً غالب کے خطوط میں معاصر دہلی کے واقعات کا جگہ جگہ اور اکثر خاصا تفصیلی ذکر ہے مگر یہ تاریخ نہیں کہ ان خطوط میں، جہاں غدر کے واقعات کا بیان ہے، اس کے ساتھ ہی ایسی اور کئی باتیں ہیں، جن کا اس مخصوص موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً اپنی بیماری، مفلسی اور دوسری پریشانیوں کا بیان یا ادبی مسائل پر اظہار خیال۔ اسی طرح بیاضوں اور روزنامچوں میں جنگ آزادی کے متعلق، اطلاعات محفوظ کر لی گئی ہیں مگر دوسرے صفحوں پر اس زمانے کے مقبول اشعار نقل ہیں اور تیسرے صفحے پر کسی گھریلو قسم کی خبر (مثلاً خاندان میں کسی بچے کی تاریخ پیدائش) اور اس کے متعلق لکھنے والے کے تاثرات رقم ہیں۔ انگریزوں نے اس جنگ کے متعلق اپنے عزیزوں کو تفصیلی خط لکھے ہیں، جن میں خاص اس دن کے واقعات کا تفصیلی ذکر ہے، جس دن وہ خط لکھا گیا۔ یہ سب تاریخ نہیں، تاریخ نویسی کے لئے ضروری، مفید مواد، معلومات ہیں۔

تاریخ کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس کی ایک ساخت وضع (Structure) ہوتی ہے اس ساخت کے بنیادی اجزا مختلف واقعات کے درمیان ربط کا اظہار اور بیان کا تسلسل ہے یعنی ایک واقع دوسرے

واقعے سے اس طرح مربوط ہوتا ہے کہ اس میں ایک Coherance اور تسلسل پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ساخت، وضع کی تشکیل کے اپنے مسائل ہیں۔ اول ایک موضوع کی تاریخ کے متعلق، خود واقعات کے انتخاب کا مرحلہ ہے، واقعات کے بے ترتیب ذخیرہ سے واقعہ کے انتخاب کی، مورخین کے نزدیک پہلی شرط تو یہی ہے کہ واقعے کو امکانات سے پُر ہونا چاہئے یعنی واقعات وہ منتخب کرنے چاہئیں جو آئندہ کے واقعات سے کسی نہ کسی طرح مربوط ہوں مثلاً باغی افواج کا دہلی میں داخل ہونا اور بادشاہ سے جنگ آزادی کی قیادت کی درخواست کرنا، تاریخ نگار کے لئے ایک اہم اور امکان سے پُر واقعہ ہے کہ اس سے آئندہ ظاہر ہونے والے واقعات کا گہرا تعلق ہے، لیکن بادشاہ کا ۹رمئی کی رات کو عشاء کی نماز پڑھنا، کھانا کھانا اور مصاحبوں سے لطف و محبت کی ہلکی پھلکی گفتگو کرنا جہد آزادی کے آئندہ واقعات پر اثر انداز نہیں ہوا۔ مزید یہ کہ یہ فیصلہ کہ کون سے واقعات آئندہ کے واقعات سے مربوط ہیں اور کون سے نہیں، مورخ کی اپنی فہم، نقطہ نظر اور ترجیحات کا پابند ہے۔ اس لئے ایک ہی عہد یا واقعہ کی تاریخ کے متعلق دو مورخین یکساں واقعات منتخب نہیں کرتے کہ ایک مورخ کے لئے ایک واقعہ کے امکانات، دوسرے مورخ کے اس واقعہ کے تئیں فیصلے سے مختلف ہوں گے۔ اس کی ایک وجہ بپن چندر پال نے آج سے تقریباً اسّی برس پہلے بیان کی ہے:

> "When the European Scientist studies the physical feature of our land, when he mesurates our field, trignometerates our attitudes and undulations, investigates our animal, our vegitable or our vegitable kingdom, the record of his study are accepted as true and authoritative. But the study of men belongs altogether to a different plane....... Here also the eye sees, the ear hears, but the real meaning of what is seen or heard is supplied not by the senses, but by the understanding which interprets what is heard in the light of his own peculiar experience and associations."1

یعنی انسان کے علاوہ، نباتات وحیوانات بلکہ کائنات کی ہر شے کے متعلق مشاہدات پر اتفاق رائے

ہوسکتا ہے بلکہ ہوتا ہے۔ لیکن انسان کے متعلق مشاہدات اور ان سے برآمد ہونے والے نتائج پر، دو مختلف زمانوں، گروہوں بلکہ بعض صورتوں میں دو افراد کے درمیان اتفاق رائے ممکن نہیں۔ اس لئے کہ انسان اور اس کے اعمال کے متعلق ہمارے موقف کا تعلق صرف اس کے مشاہدہ سے نہیں بلکہ اس مشاہدے سے مرتب ہونے والی فہم سے ہے۔ جو لازماً مشاہد کی اپنی ترجیحات وتفصیلات سے تشکیل پاتی ہے۔ واقعات کے انتخاب میں مورخین کے درمیان اختلاف کی ایک وجہ Hyden White نے یہ بتائی ہے کہ:

"Unless at least two versions of the same set of events can be imagined, there is no reason for the historian to take upon himself the authority of giving the true account of what really happened." 2

گویا خود واقعات اپنے اندر ایک سے زیادہ تعبیر کے امکانات رکھتے ہیں۔ اس لئے ایک ہی واقعہ دو مورخین کے یہاں یکساں اہمیت کا حامل نہیں ہوتا۔ اس لئے اب تاریخ کے مابعد جدید تصور میں واقعہ کو ایک Homogeneous وحدت تصور نہیں کیا جاتا کہ واقعات میں خود ان کی ضد موجود ہوتی ہے۔ مثلاً باغی فوجوں نے بہادر شاہ کو بادشاہ ہندوستان تسلیم کیا، خود بہادر شاہ، بادشاہ رہنا بھی چاہتے ہیں اور اپنی بادشاہت کے درپے انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کی قیادت سے انکار بھی کرتے جاتے ہیں۔ اپنے گھر کے چاندی کے برتن فروخت کر کے فوج کی تنخواہ دینے کا حکم صادر فرماتے ہیں اور تسبیح خانے میں اپنے ساتھیوں کے سامنے قبلہ رخ کھڑے ہو کر روتے ہوئے اللہ سے خود پر رحم کی درخواست بھی کرتے ہیں۔ بادشاہ اس سے واقف ہیں کہ زینت محل اور احسن اللہ خاں انگریزوں سے ساز باز رکھتے ہیں اور اس بغاوت کے کچلے جانے سے خوش ہوں گے۔ مگر بغاوت کا قائد بادشاہ ان کو اپنا مخالف بھی تصور نہیں کرتا۔

اگر واقعات کے مشاہدے میں تضاد موجود نہ ہوتا، تو ان باغی سپاہیوں کو جنہیں سر سید احمد خاں نے شرابی، تماش بین اور بدکار کہا، مارکس ان کی جرأت، حوصلہ مندی اور فن حرب میں ان کی مہارت کی تعریف نہ کرتا۔ ڈار لمپر نے ان مجاہدین کی نشان دہی کی ہے جو صرف اپنے دین کے تحفظ اور ایک غیر

ملک کے بدکار اور ظالم حاکموں سے نجات کے لئے اس عہد کے ساتھ لڑے کہ جب تک انگریزوں کو شکست نہیں ہوتی، یا وہ خود شہید نہیں ہوتے، کھانا نہیں کھائیں گے۔ اس جنگ کو حاجی امداد اللہ، مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے متقی اور خدا ترس بزرگوں کی حمایت حاصل ہے۔ اس جنگ میں حافظ ضامن جیسا پرہیزگار انگریزوں سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوا یہ لوگ کچھ بھی ہوں، شرابی اور تماش بین ہرگز نہیں تھے۔

واقعے کے انتخاب میں مورخ کی تیسری مشکل یہ ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ واقعہ کی پہلے سے متعین کی گئی نوعیت تبدیل ہوتی جاتی۔ ہے۔ اس کی ایک سامنے کی وجہ یہ ہے کہ واقعہ ہمارا ماضی ہے اور مورخ کا ذہن اپنے زمانے کی Epistemie (علمی نقطہ نظر) سے متاثر اور مرتب ہوتا ہے۔ تو واقعے کے بعد ہر زمانے کے مورخ کے لئے معاصر دانش کی روشنی میں اس کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے حال کے سوالوں کا جواب اپنے ماضی سے چاہتے ہیں اور اس جستجو میں، ماضی کو نئے سرے سے مرتب کرتے ہیں۔ تو واقعہ صرف وہی نہیں رہ جاتا جو اپنے وقوع کے لمحے میں تھا، بلکہ اس جواب کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جو ہمارے سوالوں کا منطقی نتیجہ ہو۔ ویریندر یادو نام کے ایک شخص نے ''۱۸۵۷ کے متھ اور وراثت'' کے عنوان سے ہندی میں ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون میں بنیادی موقف یہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس جہد آزادی میں وہ سارے لوگ، رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، راجہ کنور سنگھ وغیرہ جنہیں ہم پہلی جنگ آزادی کے ممتاز ہیرو تصور کرتے ہیں، ان کی شخصیت ان کی بہادری، جرأت۔ اور دوسرے اوصاف کو اس بھلاوے کے تحت بڑھا چڑھا کر پیش (Glorify) کیا گیا ہے کہ یہ لوگ ملک کی آزادی کے لئے لڑے اور شہید ہوئے۔ جب کہ اس مصنف کے نزدیک واقعہ یہ ہے ہی نہیں۔ یہ لوگ صرف اپنی ریاست اور امارت کے تحفظ یا اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے لڑے۔ اس سے مصنف یہ بھی نتیجہ نکالتا ہے کہ یہ ملک کی آزادی کی جنگ تھی ہی نہیں، بلکہ ذاتی مفاد کے تحفظ کی لڑائی تھی۔ اس لئے کہ ویریندر یادو کے ذہن میں ''ملک'' کی جو سیاسی تعریف ہے، اس پر ان ممتاز مجاہدین کی تقریریں اور بیانات پورے اترتے ہی نہیں، دراصل ایک سیاسی وحدت کی حیثیت سے 'ملک' کا تصور

انیسویں صدی کے ربع آخر میں قائم ہونا شروع ہوا اور بیسویں صدی کے اوائل میں اس تصور کے خط و خال روشن ہوئے۔ اب Nation کے اس نئے سیاسی تصور کی روشنی میں رانی جھانسی کے مقاصد کا تجزیہ لازماً مصنف کو اس نتیجہ تک لے جائے گا، جہاں وہ اس مضمون میں پہنچے۔

اور آخر بات یہ کہ 'واقعہ' بیان میں تبدیل ہوتے ہوئے اپنے انسانی، بشری تلازمات، جذبات اور دوسری نفسیاتی کیفیات سے محروم ہو جاتا ہے۔ آپ واقعے کے بیان میں گولی لگنے کے زخم سے ابلتے ہوئے خون کی گرمی محسوس نہیں کر سکتے اور نہ پھانسی پر چڑھائے جا رہے مجاہد کے آخری کلمہ شہادت کا سوز بیان کی گرفت میں آ سکتا ہے۔ واقعہ، تاریخ ساز تک پہنچتے پہنچتے خبر / علم میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے اور خبر بھی وہ جو راوی کی ترجیحات سے آلودہ ہو چکی ہوتی ہے۔

واقعہ بہر حال کوئی وقائع نویس یا مورخ بیان کرتا ہے اس راوی کی اپنی تربیت، ترجیحات اور فہم ہوتی ہے، جس کی روشنی میں بیان کیئے گئے واقعے کے معنی متعین ہوتے ہیں۔ اس لئے کوئی بیان کبھی بھی پوری طرح معروضی ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً ایک شخص نے دوسرے شخص کو گولی ماردی، یہ تو واقعہ ہوا۔ اس واقعہ کو مختلف طریقوں سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ ہر بیان میں واقعہ وہی ہوتا ہے مگر اس کی معنی بدل جاتے ہیں گولی مار دینے کے اس واقعہ کے بیان کی یہ تین شکلیں دیکھیے:

ا۔ پوربیے، کالے نے دو انگریزوں کو گولی ماردی۔

۲۔ تلنگوں، باغیوں نے صاحب کو گولی ماردی۔

۳۔ مجاہدین نے بیس گوروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

پہلے جملے میں 'پوربیا' پچھّم خصوصاً دہلی اور 'نواح دہلی کے لوگوں کی نظر میں تحقیر آمیز صفت ہے۔ مزید یہ کہ پوربیا اپنے گنوار پن کے سبب فوجی تربیت سے بے بہرہ بھی ہوگا۔ بیان کے یہ تینوں Signifier مل کر یہ تصور قائم کرتے ہیں کہ یہ جہد آزادی محض ایک شورش، فساد یا فتنہ تھا، جس میں نہ کوئی تنظیم تھی نہ مقصد اور نہ کوئی جوش و ولولہ تھا۔ دوسرے جملے کے تلنگے، باغی اصلاً نمک حرام اور بے اصول لوگ ہیں انہوں نے ان لوگوں سے بغاوت کی جو ان کے کفیل اور حاکم تھے اور اپنے آپ میں بہت محترم بھی تھے۔

اس لئے یہ بغاوت ہے اور ہماری زبان میں اس مفہوم میں بغاوت ایک منفی اور قابل مذمت کارروائی ہے۔

تیسرے جملے میں یہی باغی، مجاہدین کہے جا رہے ہیں، تعداد بھی مبالغہ آمیز ہے تاکہ مجاہدین کی شجاعت ظاہر ہو اور انگریز یہاں 'صاحب' بھی نہیں صرف گورا ہے، جن میں نفرت کا خفیف سا شائبہ صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جسے مورخین Inconvertible fact کہتے ہیں اس کا بیان بھی ہر جملے میں اپنے معنی بدل لیتا ہے کہ بیانیہ اگر واضح طور پر اقداری نہیں بھی ہو تب بھی اس میں ایک 'حس قدر' لازماً موجود ہوتی ہے۔

تاریخی یا افسانوی متن کی ایک لازمی صفت اس کا وضعیاتی، ساختیاتی (Structured) ہونا ہے اور ساخت (Structure) سے مراد مختلف واقعات کے درمیان رشتوں یا روابط کا نظام ہے۔ تاریخ میں رشتوں کا یہ نظام واقعات کے درمیان سبب اور نتیجہ کے تعلق کی دریافت یا تشکیل ہے۔ تاریخ میں واقعات کے درمیان یہ رشتہ 'دریافت' تصور کیا جاتا ہے جب کہ فکشن میں رشتہ 'تشکیل' دیا جاتا ہے۔

تاریخ سازی کا یہ دوسرا مرحلہ یعنی واقعات کے اسباب کی 'جستجو' خود واقعات کے انتخاب سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ چونکہ تاریخ کی مجبوری یہ ہے کہ وہ مستقبل کی پیش گوئی نہیں کر سکتی، صرف ایک واقعہ کے ماضی میں اسباب بیان کر سکتی ہے، اس لئے تاریخ نویسی میں اول تو ہم اسباب سے نتیجہ کی طرف نہیں جاتے بلکہ نتیجے، واقعے کے بعد اس کے اسباب کی جستجو کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ واقعہ کے اسباب بیان کرنا، جذیات کے ایک سلسلے کو بیان کرنا ہے، جس سے 'واقعے' کے 'معنی' کی تشکیل ہوتی ہے۔ بیان کے ذریعہ 'واقعے' کے 'معنی' کی تشکیل / تعبیر ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، اس پر رک کر گفتگو ہوگی۔ ان اسباب کے نشان دہی جو کسی واقعے یا سلسلہ واقعات کا سبب ہوتے، ہماری اپنی تربیت، ترجیحات اور دانش حاضر کی پابند ہوتی ہے، فن حرب کے ماہر کے نزدیک غدر، بغاوت، جنگ آزادی کے اسباب ماہر معاشیات کے بیان کردہ اسباب سے مختلف ہونے ہی چاہئیں کہ دونوں کی ترجیحات اور ان کی دانش کے بنیادی حوالے ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ سر سید احمد خاں نے بغاوت کے جو اسباب بیان کئے ہیں ان

میں انگریزی حکومت کی انتظامی کمزوریوں کے علاوہ، معاشی، معاشرتی اور مذہبی اسباب شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید کے بیان کئے ہوئے اسباب پر اب تک کسی نئے سبب کا اضافہ نہیں ہوا۔ لیکن ان اسباب کی جو تعبیریں ہوئیں وہ ان کا پورا سیاق و اسباق/ پس منظر تبدیل کر دیتی ہیں۔ کارل مارکس نے یہ تو اعتراف کیا ہے کہ انگریزوں نے اس ملک کے عوام پر بہت ظلم ڈھائے لیکن یہ ناگریز تھا اس لئے کہ ان انگریزوں کی حکومت بلکہ مظالم کے بغیر اس ملک کا جدیدیت (Modernism) کی راہ پر چلنا ممکن ہی نہیں تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اسے سرمایہ داری اور بادشاہت کے درمیان محاربے سے تعبیر کرتے ہیں، جن میں فتح تو سرمایہ داری (Capitialism) کی ہی ہونی تھی۔ اسباب کی ان شرحیاتی جہات سے قطع نظر تقریباً تمام معاصر وقائع نویس کارتوسوں پر گائے اور سور کی چربی کے استعمال کو سپاہیوں کی بغاوت کا سبب قرار دیتے ہیں۔ مکند لال اسسٹنٹ سرجن تاریخ بغاوت ہند میں اس واقعے کو قدرے تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ:

''دمدمہ میں کسی کمینی قوم کے ہندو نے بنگال گرانڈیر کے ایک برہمن سپاہی سے پانی پینے کو لوٹا چاہا (برہمن کے انکار کرنے پر چمار) نے سپاہی سے کہا کہ اجی مہراج آپ اپنی (ذات کی بات کرتے ہیں) آپ کو گائے اور سور کی لگی ہوئی چربی کے (کارتوس منہ سے کھولنے پڑتے ہیں، ایسے میں آپ کی) ذات کہاں رہے گی۔ برہمن نے یہ سن کر اس خبر کو اپنے بھائی بندوں میں پھیلایا۔ اس خبر کی انگریز افسروں نے فوراً تردید کی۔ سپاہیوں سے کہا گیا کہ وہ جس چیز کی چکنائی چاہیں استعمال کریں۔ یہ بھی قرار پایا کہ ولایت سے کارتوس تیار نہ آویں بلکہ کاغذ اور گولی علاحدہ علاحدہ بھیجے جاویں تا کہ وہ ہندوستان میں تیار کئے جاویں' پھر یہ ہنگامہ ہوا کہ 'ایک سپاہی مسمّی چاند خاں کے اظہار ہوئے اس نے بیان کیا کہ کاغذ کارتوس کے کاٹنے میں اعتراض اس وجہ سے ہوا کہ وہ سخت مثال چمڑے کے معلوم ہوتا ہے اور چلانے کے وقت اس میں سے بو چربی کی آتی ہے؟۔۔۔۔۔ 'علاوہ ازیں فتنہ انگیزوں نے یہ بھی مشہور کیا کہ سرکار نے ہندو کا مذہب

بگاڑنے کے واسطے آٹے میں بیل اور گائے کی ہڈیاں پسوائی ہیں، انگریزوں نے ان تمام افواہوں کی تردید کی ہر ممکن کوشش کی۔' میجر جنرل برس صاحب نے تمام فوج کے سامنے جو اس وقت پریٹ پر موجود تھی، بہت وضاحت اور صفائی کے ساتھ گورنر جنرل ہند کا حکم پڑھ کر سنایا کہ افواہیں جو درباب مذہب کے فتنہ پردازوں نے مشہور کی ہیں وہ محض بے اصل اور بے بنیاد ہیں اور سرکار انگلشیہ کو ہرگز ہرگز کبھی نہ منظور ہوا اور نہ ہوگا کہ کسی کے عقائد مذہب میں دست اندازی کرے۔"

کارتوسوں کی خبر کی تعمیر ہی اس طرح کی گئی ہے کہ اس کے افواہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر کارتوسوں پر چربی لگانی ہی تھی تو صرف گائے یا صرف سور کی چربی سے کام چل سکتا تھا ایک ساتھ ان دونوں جانوروں کی چربی کا ذکر کیا ہی اس لئے گیا ہے کہ مسلمانوں اور ہندؤں دونوں کے دل میں شک پیدا کیا جائے۔ انگریز افسروں نے اس افواہ کی تردید کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن سپاہیوں کو اس کمزور افواہ پر اتنا پختہ یقین آیا کہ صاحب بہادر کی ایک نہ چلی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس زمانے میں ایک سے زیادہ افواہوں کا بازار بالکل اچانک گرم ہوگیا۔ مشہور ہوا کہ ملک کے مختلف حصوں میں روٹیاں بٹی ہیں جو ایک خفیہ پیغام ہے کہ انگریزوں کے خلاف جنگ شروع ہونے والی ہے۔ پھر مشہور کیا گیا کہ نجومیوں نے ستاروں کی چال دیکھ کر باغیوں کو بتایا ہے کہ 'سمبت ۱۹۱۴ میں تم کو فتح نصیب ہوگی اور ہندوستان تمہارے قبضے میں آجائے گا۔' یہ بھی مشہور ہوا کہ شیدی قنبر نامی ایک شخص بادشاہ کا اس مضمون کا ایک خط لے کر شاہ ایران کے پاس گیا ہے کہ ہندستان سے انگریزوں کو بھگانے میں ان کی مدد کی جائے۔ اسی زمانے میں بادشاہ کے سکّے کی افواہ پھیلی (غریب غالب ایک ایک سے صفائی دیتے پھرے کہ سکے کا شعر ہم نے نہیں کہا) یہ افواہ بھی تھی کہ پادری ہندوستانیوں کو جبراً عیسائی بنانے کی تیاریاں کررہے ہیں۔ جب معاشرے میں افواہوں کا اتنا بازار گرم ہو تو جاننا چاہیے کہ لوگوں نے آنے والے طوفان کی آہٹ پالی ہے۔ اس معاشرے میں زیر سطح ضرور کچھ ایسا ہو رہا ہے جسے انسانوں کی چھٹی میں نے واضح طور پر محسوس کرلیا ہے۔ غصہ، نفرت، دہشت، خوف اور

امید کی یہ زیریں لہریں کبھی کسی تاریخ کی کتاب میں مذکور نہیں ہوئیں مگر فیصلہ کن واقعات کے بنیادی اسباب میں شامل ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ اگر کارتوسوں پر چربی کی افواہ نہ پھیلی ہوتی تو بغاوت شروع نہ ہوتی صرف معصومیت اور اجتماعی شعور کے تعمیری اجزا سے بے خبری کا ثبوت ہے۔ یہ مورخین 'بشمول سر سید احمد خاں ٹھیک وہی منطق دہرا رہے ہیں جو Actium کی جنگ کے متعلق پاسکال کے قول میں ہے کہ 'ہمیں اعتراف کرنا چاہئے کہ اگر کلو پیٹرہ کی ناک ذرا چھوٹی ہوتی تو پوری دنیا کا نقشہ بدلا ہوا ہوتا۔'

واقعے کے اسباب کی تنظیم میں منطقی ربط کبھی بالکل سطح پر نمایاں ہوتا ہے، جسے سائنسی منطق کی وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ممکن ہوتا ہے اور کبھی اسباب صرف علامتیں یا اشارے ہوتے ہیں، جن کی تاریخ / تعبیر خود تاریخ ساز کی ترجیحات کی رہین منت ہوتی ہے۔ مثلاً جنگ آزادی کے متعلق ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا یہ منصوبہ بند جہد آزادی تھی یا محض عام بے چینی نے ایک خاص واقعے کے نتیجہ میں بغاوت کی شکل اختیار کرلی۔ میرٹھ کے سپاہیوں کی سرکشی، پورے شمالی ہند میں جیسے جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ اس سے تو لگتا ہے کہ عوام شاید بالکل تیار بیٹھے تھے کہ کب کوئی تحریک ہو اور وہ جنگ میں کود پڑیں۔ جب کہ سرکار انگلشیہ کے بہی خواہوں نے اپنے حاکموں کو یقین دلایا کہ اس فساد میں پہلے سے کچھ بھی طے نہیں تھا، بس چند شورش پسندوں نے لوگوں کو بھڑکایا اور بیشتر رجواڑوں بلکہ خود بہادر شاہ کو زبردستی اس جنگ میں شامل کیا گیا۔ تقریباً تمام وقائع نویس اور مورخین اس پر متفق ہیں کہ بہادر شاہ کو میرٹھ اور دوسرے علاقوں سے آنے والے باغیوں / فوجیوں کے دریا پار کر کے دہلی میں آنے تک یہ خبر ہی نہیں تھی کہ ان کے حجرہ / قلعہ کے باہر کیا ہو رہا ہے اور جب وہ دوسری صبح جھروکہ درشن کے لئے آئے بھی تو انہوں نے اپنی عمر اور وسائل کے فقدان کی بنیاد پر ان 'باغیوں' کی قیادت کرنے سے انکار کیا (ظہیر دہلوی نے جھروکے والی پوری تقریر نقل کی ہے) تو کیا چندن لال (جاسوس) کی یہ اطلاع بالکل غلط ہے کہ مجاہدین کی تنخواہ دینے کے لئے بادشاہ نے اپنے قلعہ کے تمام چاندی کے برتن فروخت کردئے تھے؟ اور کیا اس شورش کے زمانے میں شہر دہلی کے انتظام کی ذمہ داری، خود بادشاہ نے بہ حکم خاص

شہزادوں کے سپرد نہیں کی تھی؟ بلکہ خود ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کی دکانیں کھلوانے نہیں نکل پڑے تھے؟

تیسری صورت یہ ہے کہ بادشاہ چاہتے تو نہیں تھے مگر باغیوں نے انہیں مجبور کیے رکھا۔ تو کیا بغاوت کے ان چار مہینوں کے درمیان کسی جاسوس کا کوئی بیان یا انگریزوں کی اپنے حکام کو لندن بھیجی گئی رپورٹوں یا خود ان کی باہمی خط و کتابت یا ان کی ڈائریوں غرض کسی طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اپنے انگریز حاکموں کو یہ اطلاع تحریر یا کسی کی زبانی بھجوائی ہو کہ وہ اس جنگ میں شامل نہیں ہیں اور نہ اس شورش کی تائید کرتے ہیں۔ بلکہ اپنی جان اور ناموس کی حفاظت کے لئے مجبوراً قیادت کا دکھاوا کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں تو مورخین یا اس واقعے پر تحقیق کرنے والے ہی روشنی ڈال سکتے ہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ بادشاہ نے رجواڑوں کو اس مفہوم کا ایک خط لکھا تھا کہ اگر سب مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ لڑیں اور انہیں ملک سے نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو انہیں بادشاہ بنے رہنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔

دراصل واقعات جس طرح ظہور میں آئے ان کو مذکورہ تینوں شکلوں میں بیان کرنا ممکن ہے۔ واقعات کی تعبیر کی اس کثرت کے سبب ان چار مہینوں کے واقعات کو ہم اب تک کوئی نام دینے میں ناکام رہتے ہیں۔ دراصل واقعے کے اسباب کی یہ جستجو اصلاً ایک متن کے 'معنی' متعین کرنے یا اس کے امکانات کی دریافت کے شرحیاتی دائرہ (Hermeneutic Circle) سے مماثلت رکھتا ہے کہ تاریخ میں نتیجے، واقعے سے اسباب کی طرف ایسے ہی سفر کرتے ہیں جیسے متن کی تشریح میں 'کل' سے جز کی طرف یا اجزا سے کل کی طرف جاتے ہیں۔ اس لئے Earnest Cassirer اور دسرے مفکرین بھی تاریخ کو سائنس کے بجائے ادب کے خانے میں رکھتے ہیں۔ Cassirer لکھتا ہے:

"If we seek a general heading under which we are to subsume historical knowledge we may describe it not as branch of Physics, but as a brand of Sematics. The rules of Sematics and not the laws of nature are the general principles of historical thought. History is included in the field of harmeneutics not in that of natural sciences" 3

بلکہ بعض لوگ تو اس سے بھی آگے جاتے ہیں۔ اسی مصنف نےBurckhardt کے خط کا اقتباس نقل کیا ہے:

> "What, I construct historically, wrote Burckhardt in a letter, is not the result of criticism or speculation but of imagination, seeking to fill the gaps in observation. To me, history is still in a large measure poetry." 4

اس لئے کسی ایک ہی واقعے کے اسباب بیان کرنے والے مورخین ایک دوسرے سے لازماً متفق نہیں ہوتے بلکہ ہمارے زمانے میں بعض معتبر لوگ تو یہ تک کہتے سنے گئے ہیں کہ کسی واقعہ کا رکارڈ جس قدر کم موجود/دستیاب ہوتا ہے، اس واقعہ کی اتنی ہی بہتر تاریخ لکھنی ممکن ہوتی ہے۔

تاریخ سازی کی اس بحث کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ خود متن کی تعمیر مصنف کی منشا یا خلوص کے بجائے ان اصولوں کی پابند ہوتی ہے، جو کسی عہد کی علمی بصیرت (Epistemie) کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس موضوع پر مشیل فوکو کے مطالعات نہایت وقیع ہیں اس کے نزدیک کوئی نظام کلام(Discourse) اصلاً ان اصولوں کا زائیدہ ہوتا ہے، جو ایک خاص عہد میں، اس زمانے کے ادارے (Institutions) اس عہد میں قوت کا توازن اور اس سے تشکیل پانے والی علمی بصیرت قائم کرتی ہے۔Hayden-White لکھتا ہے:

> "Discourse constitute the ground where as to decide what shall count as a fact is the matter under consideration and to determine what mode of comprehension is best suited to the understanding of the fact thus constituted."

یعنی واقعہ جب بیان کے لسانی روابط میں، تاریخ کی شکل اختیار کر رہا ہوتا ہے تو واقعے کی متضاد جہات میں چند روشن اور بعض معدوم ہو جاتی ہیں۔ اب یہ مسئلہ کہ کیا چیز 'واقعہ' ہے اور اس زمانی وقوع کے کون سے اجزا ایکسر واقعے ہیں، ہی نہیں، عہد تحریر کی بنیادی بصیرت طے کرتی ہےAnia Loomba نےMecheray کا ایک قول نقل کیا ہے، جو اگرچہ ادبی متون کے متعلق ہے، لیکن جس کے مرکزی مشاہدہ کا اطلاق ہر نوع کے بیانیہ پر ہوتا ہے:

"Macheray suggested that text can only be understood in the context of their utterance. The literary text is not created by an intention (objective or subjective); it is produced under determined conditions' (1978:78). When and where a text is written, the language in which it is inscribed, the tradition and debates, within which it intervenes, all come together to create a textual farbic."5

ایک عہد میں (معاشی، معاشرتی، عسکری) طاقت کا توازن، وہ ادارے تشکیل دیتا ہے، جن میں کلام/مباحث کی تنظیم کے اصول طے کیے جاتے ہیں۔ یہی اصول، اس عہد کی دانش(Episteme) کے امتیازی نقوش کا تعین کرتے ہیں۔ جن کی روشنی میں کوئی کلام بامعنی بنتا ہے۔ اس مشاہدے کی شہادت میں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستانیوں کو، انگریزی زبان اور مغربی علوم پڑھانے پر اسرار اور ہندوستانی علوم کے ساتھ ساتھ اس ملک کی صنعت وہنر کی تحقیر وتذلیل کی کوششوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ انگریزوں کے ساتھ بہادر شاہ کے آخری معاہدے کی دس شرائط میں سے چھٹی شرط یہ تھی کہ قلعہ معلّٰی کے اندر ایک انگریزی اسکول کھولا جائے گا۔ میکالے بہادر کے مشرقی علوم کے متعلق بدنام زمانہ جملے سب کو یاد ہیں اور ہم میں سے بہت سارے لوگوں کو اپنے علوم سے اب بھی شرم آتی ہے۔ لیکن جو عام نہیں وہ یہ ہے کہ یہی مسٹر مکالے اپنی پارلیامنٹ میں ہندوستانیوں کے متعلق یہ بیان دیتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ 'میں نے ہندوستانیوں جیسی زندہ اور دھڑکتی ہوئی کوئی دوسری قوم نہیں دیکھی۔ ان پر قابو پانا یا حکومت کرنا، اس وقت تک ممکن نہ ہوگا، جب تک ہم ان کی فکر اور سوچنے کے طریقے نہ بدل ڈالیں۔'

اس بیان کے بعد جب ہم مکالے کو یہ لکھتے ہوئے پڑھتے ہیں کہ ہندوستان میں وہ ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتا ہے، جو اپنی جلد کی حد تک تو ہندوستانی ہو مگر اپنی فکر وتہذیب میں انگریزوں کی طرح ہو تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے نئے حکمراں، بالکل شعوری طور پر، سوچے سمجھے منصوبے کے تحت، علم ودانش کے وہ اصول قائم کررہے ہیں، جن کی روشنی میں اچھے، برے، اثبات، نفی، علم، جہل حتیٰ کہ ایک ہی وقوع کے حقیقت/افسانہ ہونے کی ثنویت کا نیا معیار قائم ہوگا، اور واقعہ یہ ہے کہ یہی ہوا۔ انگریزی حکمت عملی

ہم (us) اور وہ (they) کا تثنیتی تخالف (Binary Opposition) قائم کرنے میں کامیاب ہوئی اور اس نے ہم ہندوستانیوں کے لئے انسان، انسانیت، علم اور فضیلت کی بنیادی تعریفیں بدل دیں اور یہ بھی طے کردیا کہ تاریخ کو 'ہم' (us) کے نقطہ نظر سے لکھا جانا ہے کہ اب 'ہم' سے کمتر، غیر مہذب کالے دیسی لوگوں کا نقطہ نظر سرے سے کوئی نقطہ نظر تصور ہی نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے اس پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ ۱۸۵۷ء کی جہد آزادی کا کوئی Photograph یا Sketch ہندستانیوں کا بنایا ہوا، وجود ہی نہیں رکھتا۔ (اب سنا ہے کہ جامعہ ملیہ کے شعبہ تاریخ میں ہندوستانیوں کے بنائے ہوئے کارٹونوں پر کوئی تحقیقی کام شروع ہوا ہے۔)

لیکن ہندوستان کی مظلوم آبادی کی اپنے حاکموں کے علوم و تہذیب کے متعلق آرا کا جائزہ لیجے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز بہادر کے قائم کئے ہوئے 'نظام کلام' سے آگے بھی کچھ ہوتا رہا ہے:

میجر ارتھر کاٹن، جو انیا لومبا کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق، جدید آب پاشی (irrigation) کے بنیادگزار ہیں، جب ہندوستان تشریف لائے تو انہوں نے دیکھا کہ دیسی لوگ

> "Spoke with contempt, of english, calling them a king of civilized savage, wonderfully expert about fighting, but as inferior to their great men that we could not even keep in repair the work they hadconstructed much less, even imitate them in extending the system"6

کاٹن نے مزید اعتراف کیا ہے کہ ریت کی نامعلوم گہرائی تک ڈھیلی ڈھالی/پولی (Loose) زمین میں، بنیاد قائم کرنے کا ہنر اس نے ہندوستان کے دیسی ماہرین سے سیکھا اور پھر کاٹن لکھتا ہے:

> "...... .... With this lesson about foundation we built bridges weirs, aguaducts and every kind of hydraulic works" 7

عبدالطیف نے غدر کے متعلق اپنے روزنامچے (مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی) میں لکھا ہے کہ بیگم بازار دہلی کے اسلحہ سازوں کو جب یہ خبر ہوئی کہ مجاہدین کو آلات حرب کم پڑ رہے ہیں تو ان لوگوں نے ان کے لئے آلات حرب ڈھالنے کی ذمہ داری خود اٹھالی اور انہوں نے جو توپیں، بندوقیں اور گولے تیار

کئے، وہ انگریزی فوج کے آلات حرب سے، اپنی طاقت، کارکردگی اور Precision میں، کسی طرح کم نہ تھے۔ دہلی پر قبضہ کے بعد انگریزوں نے یہ پوار محلّہ، بیگم بازار، نیست و نابود کردیا۔ اب کوئی نہیں جانتا کہ یہ بیگم بازار کہاں تھا اور اس محلے کے وہ توپ ڈھالنے والے کہاں گئے۔

تو میکالے بالکل ٹھیک سمجھتا تھا کہ ہندوستان کی ذہانت، اس کی صنعت و ہنرمندی اور ان کی معاملہ فہمی پر کبھی فتح نہیں پائی جاسکتی جب تک ہم اس خطہ ارض میں علم و دانش کا پورا Paradigm نہ تبدیل کردیں۔ اس انگریزی سوچ بلکہ سازش کا سب سے قوی وسیلہ انگریزی زبان کے ذریعے مغربی علوم کی تعلیم تھا اور اس میں شک نہیں کہ تنہا اس تعلیم نے اس ملک کے فطری ارتقا کی نہج بدل دی، گھریلو صنعتیں تباہ گئیں، مشین کو دست کاری پر فوقیت حاصل ہوئی۔ مادی دولت سازی انسان جدوجہد کا مقصد مقرر ہوا، جس کے لئے سازشوں کے نئے وسائل تیار کئے گئے، ہندوستانیوں کو یقین دلایا گیا کہ صنعت، زراعت یا تجارت، ذریعہ معاش کی حیثیت سے ناکام ہو چکے ہیں اور ذریعہ عزت تو اب بالکل نہیں رہے۔ اس کی جگہ صرف نوکری اور وہ بھی نئے سرکار بہادر کی نوکری ہی انہیں معاشی آسائش اور عزت واعتبار دونوں دلا سکتی ہے۔ ہندوستانیوں کو ۱۸۵۷ء کی جنگ سے بڑی اور فیصلہ کن شکست اس محاذ پر ہوئی کہ انہیں بھی یقین آگیا کہ ہمارے صاحب بہادر بالکل صحیح کہتے ہیں۔ اب بھی کوئی کوئی دلیر انگریز یہ کہتے ہوئے سنا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان میں ہمیں علم وتہذیب سکھانے آئے تھے۔ کھرے سکے (Capital) کو معیار تسلیم کرنے والے ہندوستانی بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں مادی ترقی کی موجودہ نہج ہی اس کی فطری نہج ہے، جس پر ہمیں حکومت انگلشیہ نے لگایا۔

مشیل فوکو کے نظام کلام (Discourse) کی تشکیل کے طریقہ کار اور اس کے معاشرتی نتائج کی تحقیق کے اصولوں کی روشنی میں، ایڈورڈ سعید اور ہومی بھابھا نے مشرقیات کے حوالے سے جو کتابیں / مضامین شائع کی ہیں ان سے رفتہ رفتہ زور سے بولے گئے اس جھوٹ کی قوت کمزور پڑنے لگی ہے۔ کسی حد تک Paradigm تبدیل ہورہے ہیں اور ہمیں لگنے لگا ہے کہ سب کچھ ویسا اور اتنا ہی نہیں ہے، جیسا اور جتنا اس عہد کی مغربی دانش نے ہمیں یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔

اب جب Discourse کی تعمیر کے وسائل کی تعمیر سے پردے اٹھنے لگے ہیں، دوسرے تمام علوم کی طرح روایتی تاریخ نگاری بھی معرض سوال میں ہے۔۔۔'واقعہ' کیا ہے؟ اس کے وحدانی (Homogenous) کردار کی حقیقت کیا ہے؟ کسی واقعہ کے اسباب کی جستجو کا مورخ/راوی کی ذاتی ترجیحات، مصلحتوں سے کیا تعلق ہے؟ بیانیہ کا بنیادی کردار، واقعہ کی تعمیر پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟ بیان کی تعمیر میں معاصر طاقت (معاشی، علمی، عسکری) کے تناسب کا کیا رول ہے؟ یہ وہ سوال ہیں، جن کی روشنی میں فن تاریخ نویسی کا نئے سرے سے جائزہ لیا جارہا ہے اور جو نتائج برآمد ہو رہے ہیں ان سے تاریخ نگاری کی معروضیت، مورخ کی دیانت، واقعہ کی وحدانیت (Homogenioty) اور اس تاریخ کے مطالعہ سے برآمد ہونے والے نتائج کی افادیت، جیسے تاریخ نویسی کے تمام روایتی تصورات،

ریت کی دیوار کی طرح بیٹھ گئے ہیں اور Louis Martin کے الفاظ میں صاف نظر آرہا ہے کہ:

"Everything occurs as though....... absolute power were re-counting its own story through the annonymous voice and writing of the narrator, who sees only what is it allows him to see. Thus the historian is the simulacurum of the king, his narrative, the simulations of the soverign's history, whose effect is perfect narrative representation, without exess or loss" 8

جنگ آزادی ۱۸۵۷ کی تاریخ کی حد تک یہ مشاہدہ بالکل صحیح ہے۔

حواشی

1- Ania Loomba; Colonialism/Post Colonialism; p-46
2- Hyden-White; The Value of Narritivity; p-75
3- Earnest Cassier, An Essay on Man; p-17
4- Ibid; p-203-204
5- Ania Loomba;Colonialism/Post Colonialism; p-36
6- Ania Loomba; Colonialism/Post Colonicalism' p-67
7- Ibid; p-67
8- Ania Loomba; p-222

پروفیسر قاضی جمال حسین

غالب کی روشِ خاص اور سادہ بیانی کا مسئلہ

تذکرہ نگاروں اور غالب کے سوانح نگاروں نے بارہا اس بات کا ذکر کیا ہے کہ مرزا کی شعر گوئی کا ابتدائی زمانہ پیچیدہ بیانی اور دقت پسندی کا تھا کہ وہ خیالی مضامین نظم کرتے اور اپنی جولانی طبع کے کرشمے دکھاتے تھے۔ لیکن مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ اور بعض دوسرے دوستوں کی روک ٹوک سے وہ اس بے راہ روی سے باز آگئے اور اپنی اس مخصوص روش پر انہوں نے چلنا چھوڑ دیا۔ حالی لکھتے ہیں:

''بہر حال مرزا ایک مدت کے بعد اپنی بے راہ روی سے خبردار ہوئے اور استقامت طبع اور سلامتی ذہن نے ان کو راہ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا۔''

مزید لکھتے ہیں:

''گو ان کا ابتدائی کلام جس کو وہ حد سے زیادہ جگر کاوی اور دماغ سوزی سے سرانجام کرتے تھے مقبول نہ ہوا مگر چونکہ متخیلہ سے بہت زیادہ کام لیا گیا تھا اس میں ایک غیر معمولی بلند پروازی پیدا ہو گئی تھی۔'' (یادگار غالب صفحہ ۱۱۷۔۱۱۶، مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۶ء)

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا خیال ہے:

''در اوائل حال بہ تقاضائے طبع دشوار پسند بہ طرز مرزا عبدالقادر بیدل سخن می گفت و دقت آفرینہا می کرد، و آخر الامر ازاں طریقہ اعراض کردہ انداز مطبوعہ ابداع نمودہ۔'' (گلشن بے خار، صفحہ ۱۳۹)

مروجہ اسالیب اظہار اور مقبول عام پیرایۂ بیان کا یہ جبر اس قدر حاوی ہوا کہ معاصرین سے قطع نظر

خود مرزا کو یہ خیال ہونے لگا کہ ان کا علوِ تخیل اور منفرد انداز بے راہ روی کی ایک صورت کہ جسے نو مشقی کی ابتدائی کاوش سمجھنا چاہئے۔ جواب خود ان کی نظر میں بھی لائق اعتنا نہیں۔ چنانچہ مولوی عبدالرزاق شاکر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''قبلہ ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل واسیر وشوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسداللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے۔'' (بنام مولوی عبدالرزاق شاکر، ادبی خطوط غالب مرتبہ مرزا محمد عسکری صفحہ ۱۲۲)

اس طرح بیانات سے خیال ہوتا ہے کہ غالب کی مقبولیت اور انفرادیت کا انحصار نکتہ چینوں کے طنز د تعریض کے سبب 'راہ راست' پر آنے کے بعد کہے گئے اشعار پر ہے اور یہی منتخب کلام ان کا نمائندہ کلام ہے۔ جبکہ مرزا کا ادبی رویہ، متعدد خطوط میں جستہ جستہ ان کے بیانات اور سب پر مستزاد، ان کا اردو، فارسی دیوان سوانح نگاروں کے اس خیال کی نفی کرتا ہے۔ معاصر شعراء کے مضامین واسالیب اظہار کے بارے میں غالب کا موقف تو یہ تھا:

ہر چہ در گفتار فخرِ تست، آں ننگِ من است

مرزا کی ایجاد پسند طبیعت کے مضامین کی جستجو اور معنی کی تلاش میں ادراک کی ان دیکھی سرحدوں سے گزر کر محسوسات یا جذبات کے بجائے، تصورات کا ایک نیا عالم ایجاد کرتی ہے اور ایک عام قاری اس عالم دیگر سے ذہنی ہم آہنگی قائم کرنے میں بسا اوقات خود کو عاجز پاتا ہے۔ حالی نے مرزا کے عاشقانہ اشعار کے متعلق نہایت بلیغ بات کہی ہے کہ تہہ داری اور ندرت کے باوجود مرزا کے عاشقانہ اشعار میں وہ گرمی اور تاثیر نہیں ہوتی جو شعر کی جان اور غزل کا ایمان ہے۔ لکھتے ہیں۔۔

'عشق و محبت اور تمام تعلقات و معاملات عاشق و معشوق کا بیان، جیسا کہ ظاہر ہے محض نیچرل سادگی اور بے تکلفی چاہتا ہے اور شاعرانہ صنعت سے، جس کو مرزا نے جابجا شاعری کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اِبا کرتا ہے۔ برخلاف اس کے مرزا اصناف کلام میں اپنی مصطلح شاعری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے اِلا ماشاء اللہ۔ اس لئے ان کے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال جزالت و متانت کے وہ گرمی و تاثیر جو شعر کی جان اور غزل کا ایمان ہے عام طور پر نہیں پائی جاتی۔'' (یادگار غالب صفحہ ۱۹۷)

دراصل شاعری میں مرزا کا سروکار گرمی اور تاثیر سے کہیں زیادہ مضامین تازہ کی تلاش اور حق آفرینی سے تھا۔ نازک خیالی ان کے نزدیک کلام کا جوہر تھا۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو انہوں نے لکھا تھا کہ ''بھائی شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں۔'' نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے کلام میں جو بات انہیں سب سے زیادہ اپیل کی ہے اسے۔ قاضی عبدالجلیل جنون کے نام خط میں اپنے اشعار کی تشریح کرتے ہوئے کہیں تو کہتے ہیں اس مطلع میں خیال ہے دقیق، مگر کوہ کندن و کاہ برآوردن، کہیں یہ کہ یہ بہت لطیف تقریر ہے۔

حسن اور اس پہ حسن ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم　　اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں

کے معنی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں 'مولوی صاحب کیا لطیف معنی ہیں داد دینا۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم　　میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

کی تشریح میں لکھتے ہیں۔ یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے۔ پھر تفصیل سے ان کے خلاف مقدمات بیان کرتے ہیں جن پر شعر کا سمجھنا موقوف ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں حزیں کے ایک مطلع پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں ایک 'ہنوز' زائد ہے یہ غلط معنی ہے سُقم ہے۔ یہ عیب ہے اس کی پیروی کون کرے گا۔ حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع اگر جبریل کا ہوتا تو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔

یہ واقعہ ہے کہ غالب کے معاصر مولوی عبدالقادر رامپوری اور حکیم آغا جان عیش سے لے کر یگانہ چنگیزی تک غالب کو مہمل گو سے لے کر معمولی شاعر تک کہنے والوں کی ایک مسلسل تاریخ ہے اور سبھی نے اپنی فہم کے مطابق ان اسباب کی نشاندہی بھی کی ہے جو غالب کی عظمت پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ ڈاکٹر

عبدالطیف کو غالب کے کلام میں زندگی سے ہم آہنگی کی کمی کا شکوہ ہے جو ان کے نزدیک پُرعظمت شاعری کی بنیادی شرط ہے۔ ان کے خیال میں غالب کا ذہن خارجی دنیا یا اجتماع سے وہ ہم آہنگی پیدا نہ کر سکا جو ذہن انسانی کی رفعت اور بلندی کے لئے ناگزیر ہے۔ غالب کی انفرادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے حسن عسکری نے بھی تقریباً اسی قسم کی بات کہی ہے کہ غالب کے نزدیک روحانی بلندی کا فقط ایک ہی تصور تھا کہ تعینات کو نیچے چھوڑ کر اوپر اٹھیں جبکہ میر انہیں تعینات میں رہ کر اور تعینات کی تہہ میں جا کر روحانی درجہ حاصل کرتے ہیں۔

حیرت اس وقت ہوتی ہے جب غالب کے سب سے بڑے اداشناس اور عقیدت مند خواجہ حالی بھی مرزا کے خاص رنگ کو بیان کرنے میں اعتذار کا لہجہ اختیار کرتے ہیں اور اس وقت صاف محسوس ہوتا ہے کہ کلام غالب کے محاکمے کے لئے جداگانہ معیاروں کی ضرورت کا اعتراف کرنے میں غالب کے تئیں حالی کا پورا رویہ اس شعریات کا زائیدہ ہے جسے خواجہ حالی مطالعہ غالب کے لئے بے سود قرار دیتے ہیں اور نئے معیاروں کی ضرورت پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن وہ نیا معیار کیا ہوگا؟ اور وہ نئی شعریات کن اصولوں پر قائم ہوں گی؟ اس کی واضح نشان دہی حالی نہیں کرتے۔ شاہ نصیر اور ناسخ کی طباعی کا اعتراف کرنے کے باوجود اس عہد کا ادبی معاشرہ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کو غزل کی روایت سے ہم آہنگ پاتا ہے۔

محمد حسین آزاد نے ناسخ کے ترجمہ میں ان کی خیال ہندی اور مضمون آفرینی کا دفاع کرتے ہوئے نہایت پتے کی بات کہی ہے کہ۔۔۔

> ''خیال بند، طباع اور مشکل پسند لوگ اگرچہ اپنے خیالوں میں مست رہتے ہیں مگر چونکہ فیض سخن خالی نہیں جاتا اور مشق کو بڑی تاثیر ہے اس لئے مشکل کلام میں بھی ایک لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے ان کے اور ان کے طرف داروں کے دعوؤں کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے۔'' (آب حیات، صفحہ ۳۴۴)

عبارت کا بین السطور، آزاد کے پیرایۂ بیان سے ہی ظاہر ہے کہ خیال بند شعرا کے تئیں خود ان کی

رائے کیا ہے؟ لکھتے ہیں۔۔

'مشکل کلام میں بھی ایک لطف پیدا ہو جاتا ہے'

ظاہر ہے کہ کلام کا اشکال لطف میں مانع ہے لیکن فیض سخن اور مشق کی بدولت جو لطف پیدا بھی ہوتا ہے وہ اپنی تاثیر اور کیفیت میں غزل کے مانوس لطف اور اس تاثیر سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ خیال بندی اور مضمون آفرینی کا لطف مہم سر کرنے، مشکل گرہ کو کھولنے یا معنیٔ دیریاب کو پا لینے کا لطف ہے جو عام انسانی جذبات کی تحریک اور اس کی لطیف تہوں میں ارتعاش سے حاصل ہونے والے لطف سے بہ مراحل دور ہے۔

محمد حسین آزاد مزید لکھتے ہیں کہ

'فارسی میں جلال اسیر قاسم مشہدی بیدل اور ناصر علی وغیرہ استاد گزرے ہیں جنہوں نے اپنے نازک خیالوں کی بدولت خیال بند اور معنی یاب لقب پایا۔' (آب حیات صفحہ ۳۴۲)

ریختہ میں دو یا زیادہ سے زیادہ تین شاعروں کی انفرادی کاوشیں وہ بھی بعض صورتوں میں ناکام اور بے مزہ! بھلا جگر کاوی کی یہ روش کیونکر قبول عام یا سند کا درجہ حاصل کرتی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے سیر حاصل مضمون 'خیال بند غالب' میں حالی اور محمد حسین آزاد کے دفاعی لہجے کو مختلف فارسی شعرا کے حوالے سے ایک مثبت اور توانا آواز میں تبدیل کرنے کی پُر زور کوشش کی ہے۔ فاروقی کی طویل بحث و تمحیص کے بعد اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ خیال بند شعرا بہ شمول غالب عالم آشنائی سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ وہ اپنی لفظیات، تراکیب، استعاروں اور مضامین سے ایسی فضا تعمیر کرتے ہیں جو عام قاری کے لئے یکسر نامانوس ہوتی ہے۔ ان کے کلام کا مرادی قاری یا قارئین کا طبقہ اچانک تبدیل ہو جاتا ہے۔ نمونے کے طور پر متداول دیوان سے فقط چند اشعار ملاحظہ ہوں۔۔

خط عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد — یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

مستی بہ ذوق غفلت ساقی ہلاک ہے — موج شراب یک مژۂ خوابناک ہے

بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا شیشہ میں نبض پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے
ہے وحشت طبیعت ایجاد یاس خیز یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
ہر سنگ وخشت ہے صدف گوہر شکست نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

متداول دیوان کے ان اشعار کے بارے میں مجموعی طور پر مندرجہ ذیل باتیں کہی جا سکتی ہیں۔

۳۔ تراکیب نے خیالات کو مزید گنجلک اور معنی کو ژولیدہ بنا دیا ہے

۴۔ اجزائے شعر میں اکثر مقدمات محذوف ہیں اس لئے باہمی ربط کی تفہیم کے لئے بعض تمہیدی بیانات ضروری ہیں۔

۵۔ شعر کا مضمون اجنبی ہے۔قدما کے کلام میں ان مضامین کی روایت عام طور پر نہیں ملتی۔

۶۔ اشعار کا سردکار تعقلاتی اور بڑی حد تک تجریدی ہے۔

۷۔ ان اشعار سے وابستہ لطف احساسی اور وجدانی کے بجائے تعقلاتی اور تعمیری نوعیت کا ہے۔

۸۔ اور آخری بات یہ کہ اپنی جگر کاوی اور نکتہ رسی سے قاری جب تک مصرعوں کا منطقی ربط درست کرتا ہے جذبے اور احساس کا پورا نظام درہم برہم ہو چکا ہوتا ہے بلکہ زمانی عرصے کی طوالت کے سبب یہ نظام قائم ہی نہیں ہو پاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ مرزا کی طبیعت غایت درجہ ایجاد پسند تھی اور تخلیقی وفور بھی بے نہایت تھا، انہیں اس حقیقت کا نہ صرف علم تھا بلکہ اس کا شدید احساس بھی تھا کہ انہیں اپنی نثر اور شاعری کسی کی بھی دادِ 'باندازۂ بایست' نہیں ملی۔ مرزا کے خیالات ایسے بلند اور طبیعت اتنی پر جوش تھی کہ رسوم و قیود کی پابندی انہیں منظور ہی نہیں تھی۔تمام معاصرین ان کے سامنے نہ صرف یہ کہ کم مایہ تھے بلکہ مرزا سمجھتے بھی یہی تھے۔ ایسی صورت میں گنجفہ باز خیال فقط اخص الخصوص کو ہی اپنی محفل میں باریابی کی اجازت دیتا ہے تو کیا تعجب!

محمد حسین آزاد نے ناسخ کی نازک خیالی اور خیال بندی کا تجزیہ کرتے ہوئے دلچسپ بات لکھی ہے کہ:

''بعض طبیعتیں ابتدا ہی سے پر زور ہوتی ہیں۔ فکران کی تیز اور خیالات بلند ہوتے ہیں۔ مگر استاد نہیں ہوتا کہ اس ہونہار بچھیرے کو روک کر نکالے اور اصول کی باگوں پر لگائے پھر اس خودسری کو ان کی آسودہ حالی اور بے احتیاطی زیادہ قوت دیتی ہے جو کسی جوہر شناس یا سخن فہم کی پروا نہیں کرتی۔ وہ اپنی تصویریں آپ کھینچتے ہیں اور آپ ان پر قربان ہوتے ہیں۔

ملحوظ رہے کہ ناسخ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے اگر آب حیات کی روایت درست ہے تو شیخ صاحب ایک دن اغیار کی نظر بچا کر اپنی غزلیں میر صاحب کی خدمت میں بہ غرض اصلاح لے گئے لیکن خدا معلوم میر صاحب نے ناسخ سے کیا کہہ دیا کہ دل شکستہ ہو کر واپس چلے آئے اور یہ کہا کہ میر صاحب بھی آخر آدمی ہیں فرشتہ تو نہیں! اپنے کلام کو آپ ہی اصلاح دوں گا۔''

خوبی قسمت سے مرزا غالب کو ملا عبدالصمد کی شکل میں استاد تو مل گیا لیکن 'تا بہ کے' کسی کی بھی شاگردی غالب کے منصب سے فروتر تھی چنانچہ مرزا کی زبان سے یہ بھی سُنا گیا کہ

''مجھ کو مبداُ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استادا کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کے لئے میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا۔'' (یادگار غالب صفحہ ۱۴)

یہ اخذ فیض زمبداُ فزونم از اسلاف　　　که بوده ام قدرے دیرتر دراں درگاه

یعنی میں مبداء فیاض سے اخذ فیض کرنے میں اسلاف سے بھی بڑھ کر ہوں۔ کہ وہ مجھ سے پہلے دنیا میں آگئے۔

ان کے بعد دنیا میں آنے کی وجہ سے مجھے غیب سے فیض حاصل کرنے کا وقت زیادہ میسر آیا۔

یہ انداز بیان معاصرین پر اپنی برتری کا اظہار نہیں بلکہ نہایت لطیف شاعرانہ حسن کے ساتھ اسلاف پر بھی اپنے تفوق کا اعلان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عامۃ الورود تجربات کا سادہ اور مانوس پیرایہ میں بیان غالب کو کبھی خوش نہیں آتا۔ بہ قول شیفتہ ان کی فکر کا شاہین عنقا سے کم کسی دوسرے شکار پر راضی نہیں اور ان کا اشہب خیال عرصہ فلک کے سوا کسی دوسری جولانگاہ کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اظہار کی ندرت اور خیال کی پیچیدگی کے بغیر مرزا کے نزدیک کوئی کلام لائق اعتنا ہی نہیں۔

سخن سادہ دلم را نہ فریبد غالب نکتہ چند بہ پیچیدہ بیانی بہ من آر

☆☆☆

غالب اکیڈمی کی نئی کتاب

مطالعات خطوط غالب

انتخاب: حکیم عبدالحمیدؒ

قیمت: -/150 روپے

صفحات: 152

خطوط غالب کے تعلق سے اہم مضامین کا انتخاب۔

وسیم احمد سعید

مولانا فضل حق خیر آبادی

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

مولانا فضل حق خیر آبادی جنگ آزادی 1857 کے ایک نامور مرد مجاہد تھے۔ انھوں نے اس انقلاب میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا جس کا اعتراف مورخین وقت نے یکساں طور پر کیا ہے۔ لہٰذا اگر مولانا کو قائد انقلاب کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے یا پھر نقیب انقلاب کے نام سے بھی انھیں یاد کیا جا سکتا ہے۔

مولانا فاروقی شیخ تھے اور ان کے والد ماجد کا نام مولانا فضل امام خیر آبادی تھا جو علمائے عصر میں ممتاز اور علوم عقلیہ کے اعلیٰ درجے پر سرفراز تھے اور دینی و دنیوی دونوں ہی دولتوں اور نعمتوں سے مالا مال تھے۔ ان کے والد یعنی مولانا فضل حق خیر آبادی کے دادا مولانا محمد ارشد نے ہرگام کو خیر باد کہہ کر خیر آباد ضلع سیتا پور اودھ میں سکونت اختیار کی تھی۔ مولانا کا شجرۂ نسب اگر آپ مولانا سے ہی شروع کریں تو 33 واسطوں کے بعد امیر المومنین خلیفۃ المسلمین حضرت عمر الفاروقؓ تک پہنچتا ہے جو ایک انتہائی قابل فخر اور خوش نصیبی کی بات ہے جس کے بعد مولانا کے خاندانی پس منظر پر کسی بھی قسم کی قلم طرازی بے معنی ہوگی۔

مولانا فضل حق خیر آبادی اپنے آبائی وطن خیر آباد میں 1212ھ مطابق 1797 پیدا ہوئے تھے۔ یہی سال مرزا غالب کی پیدائش کا بھی ہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم کا آغاز خیر آباد سے ہی ہوا اور پھر آپ نے علم و فضل میں ایسا کمال حاصل کیا اور اپنی حیات ہی میں ایسی شہرت حاصل کی جو اکثر علماء کو حیات کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی۔ آپ کو دینیات و فقہ میں عبور حاصل تھا جس کی وجہ سے سرزمین ہند

میں بلاشبہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ ایک جید عالم تھے۔ خصوصاً عربی زبان میں وہ قادر الکلام، قادر القلم اور قادر اللسان تھے۔

مولانا کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی اہلیہ بی بی وزیرن دختر منشی فضل احمد بن حسین میاں تھیں جن سے تین صاحبزادیاں پیدا ہوئیں اور ایک صاحبزادے مولانا عبدالحق خیر آبادی۔ مولانا کی زوجۂ ثانی دہلی کی تھیں ان سے دو صاحبزادے مولوی شمس الحق اور مولوی علاء الحق پیدا ہوئے۔ مولانا عبدالحق کو شمس العلماء کا خطاب بھی ملا، مولانا فضل حق خیر آبادی کو بہت عزیز تھے۔ مولانا عبدالحق نے والد ماجد کے نام نامی کو اور گرامی بنایا اور اسی لائق شاگرد نے فائق استاد کو مزید بالا مقام تک پہنچایا۔

اس سلسلے میں یہاں ایک دلچسپ واقعہ کا بیان از خود اس حقیقت کا آئینہ ہے۔

مولانا کے دوران اسیری جزیرۂ انڈمان میں بعض اسیر فرنگ علماء نے دریافت کیا کہ انھوں نے ہندوستان میں کیا یادگار چھوڑی ہے تو مولانا نے برجستہ فرمایا ایک حاشیہ شرح قاضی مبارک اور دوسری یادگار برخوردار عبدالحق۔

اس جملہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کو عبدالحق کس قدر عزیز تھے ا۔ غالباً یہی موقع ہے کہ یہیں پر ایک برعکس واقعہ بھی پیش کردیا جائے۔ مولوی اکرام اللہ شہابی گوپاموی نے شمس العلما مولانا عبدالحق خیر آبادی سے پوچھا، بھائی دنیا میں حکیم کا اطلاق کن کن لوگوں پر ہوتا ہے تو مولانا عبدالحق فرماتے ہیں کہ ''بھائی ساڑھے تین حکیم اس دنیا میں ہیں۔ ایک معلم اول ارسطو۔ دوسرے معلم ثانی فارابی، تیسرے میرے والد ماجد مولانا فضل حق اور نصف بندہ۔

انڈمان میں کیسی کیسی ہستیاں تھیں جن کے سینوں میں علم کا بحر بیکراں ہمیشہ موجزن رہتا تھا۔ غالباً یہ مولانا فضل حق خیر آبادی جیسی ہستیوں کی موجودگی کا نتیجہ تھا کہ انڈمان جیسا بدنام جزیرہ دارالعلوم بن گیا، لیجیے مولانا فضل حق خیر آبادی کی علم و دانائی کا ایک اور واقعہ پیش ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مولانا دہلی میں سرشتہ دار کے عہدہ پر فائز تھے۔ قاضی الیاس حسین سیتاپوری راوی ہیں کہ دہلی کے کسی پل پر کسی وجہ سے آمد و رفت بند کردی گئی تھی۔ علامہ کے پاس چند لوگ حاضر ہوئے اور پل پر سے

بارات لے جانے کی اجازت چاہی۔ مولانا نے دستخط شدہ اجازت نامہ دے دیا۔

''روکو مت جانے دو''

یہ پرچہ دیکھ کر محافظین پل نے بارات کو جانے دیا۔ حکومت کی طرف سے محافظین کا جواب طلب ہوگیا اور انھوں نے مولانا کا اجازت نامہ پیش کردیا۔ مولانا نے جواب دیتے ہوئے فرمایا میں نے تو لکھا تھا ''روکو'' مت جانے دو'' افسران لاجواب ہوگئے اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ مولانا نے اپنی عقل و دانائی سے غریبوں کا کام بھی نکال دیا اور خود پر کسی قسم کا الزام بھی نہ آنے دیا۔

درس و تدریس کے علاوہ مولانا کا قلم کبھی خاموش نہیں رہا اور ان کے قلم کی گل افشانیوں سے بے شمار تصانیف وجود میں آئیں۔ جن کی تعداد عربی رسائل کے علاوہ چالیس (40) سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ مولانا کے دیگر عربی رسائل بھی کافی تعداد میں ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مولانا کی چند ہی تصانیف زیور طباعت سے آراستہ ہوسکیں اور باقی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ مطبوعہ تصانیف بھی اب بالکل ناپید ہیں۔ مولانا کی شخصیت افق علم و حکمت پر کوکب درخشاں بن کر چمکی ہے۔ قدرت نے ان کی ہستی میں گوناگوں کمالات جمع کردئے تھے۔ وہ ایک یگانہ روزگار فلسفی، یکتائے زمانہ فاضل لغت و ادب اور علوم دینیہ کے عالم بے مثال تھے۔ سرسید جیسے مفکر اور دانشور مولانا کے فضل و کمال کے معترف تھے تو غالب جیسے نامور اور فلسفی شاعر کو مولانا سے والہانہ عقیدت تھی۔ غالب تو مولانا کی وفات کے بعد اپنی زندگی کو بے کیف سمجھنے لگے تھے۔ جبکہ شاعر امیر مینائی جیسی صاحب علم ہستیاں مولانا کو افضل الفضلاء اکمل الاکملا۔ فضائل دستگاہ اور فواضل پناہ کہا کرتی تھیں۔

شعر و سخن کے میدان میں بھی مولانا تاریخ ادب کے اوراق پر اپنے نقوش چھوڑ گئے ہیں جو نا قابل فراموش ہیں۔ عربی کے وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے اور ایک بلند مقام پر فائز تھے، ان کے عربی اشعار کی تعداد تقریباً چار ہزار سے زائد ہے۔ عربی زبان میں تخلص کا معمول نہیں ہے۔ مولانا کی علمیت کا زندہ جاوید ثبوت ان کی عربی کی تصانیف موجود ہیں یا پھر ان کے عربی خطبات۔ اس کے علاوہ ادب کی کیسی بیش بہا خدمات انھوں نے انجام دی ہونگی، اسکا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا کس مٹی کے خمیر

تھے؟ خیر آباد کی مردم خیز زمین جس نے اردو ادب کو ایسے شہرۂ آفاق، گوہران سخن عطا کیے جو آج بھی اردو ادب کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ مولانا نے جب آنکھ کھولی تو خیر آباد اور اس کے اطراف علم وفضل سے جلوہ گر تھے۔ خیر آباد کی فضائیں شعر وادب سے معطر ہو رہی تھیں۔ وہ خیر آباد جس نے ایسی شمع سخن روشن کی جس سے ہندوستان کا شعری ادب آج بھی منور ہے۔

لہٰذا یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس ماحول میں پرورش پانے والا ذہن کیسی تاریخ ساز ہستی کا امین ہوگا۔ مولانا خیر آباد سے دہلی پہنچے تو وہاں ایک سے ایک بڑھ کر باکمال نظر آیا۔ مفسرین، محدثین فقہا، فلاسفہ، اولیا اور شعرائے اکرام کا اجتماع دہلی میں پہلے سے موجود تھا۔

مولانا کا دہلی میں قیام تین بار رہا۔ پہلی بار جب ان کے والد ماجد دہلی میں سرشتہ دار تھے۔ دوسری بار جب وہ خود یہاں ملازمت کے سلسلہ میں مقیم رہے اور تیسری بار جب وہ الور کی ملازمت سے مستعفی ہو کر دہلی تشریف لائے جب انقلاب کی آمد آمد تھی اور چنگاریاں شعلوں میں تبدیل ہونے والی تھیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مولانا نے قائد انقلاب کی حیثیت سے وہ کردار ادا کیا جو ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھا جانا چاہیے، جس کا تذکرہ بھی ضروری ہے لیکن اس سے قبل دہلی میں مولانا کی ادبی مشغولیات اور غالب سے ان کے گہرے اور مخلصانہ تعلقات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

غالب جیسے نامور اور فلسفی شاعر کو مولانا سے والہانہ عقیدت تھی، مولانا نے دوران قیام رام پور نواب سے ہمیشہ غالب کی تعریف وتوصیف کی، جس کی وجہ سے مرزا کو مالی فائدہ پہنچا، اور غالب کا براہ راست رامپور سے رابطہ قائم ہوا اور یہ تعلق ان کے لئے کافی عرصہ تک فائدہ مند ثابت رہا۔ یہ مولانا ہی کی کرم فرمائی کا نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی مولانا ہمیشہ مرزا غالب کی مالی امداد کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

مولانا کے ساتھ مرزا غالب کے گہرے تعلقات شاید اس وجہ سے بھی تھے کہ وہ دونوں ہم سن تھے، دونوں کا سال پیدائش 1797ء تھا۔ جبکہ مفتی صدرالدین خاں آرزو دونوں سے (8) سال بڑے

تھے۔تینوں ایک دوسرے کے ہم جان وہم قالب تھے۔یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ مفتی صاحب مولانا سے (8) سال بعد ہی دنیا سے رخصت ہوئے۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ مرزا غالب نے ولادت میں ایک دوست کا ساتھ دیا اور وفات میں دوسرے کا۔

مرزا غالب کا شعر گوئی کا انداز بھی سے جدا تھا اور ان کی طبیعت مشکل پسند تھی جس میں علماء وفضلاء کی قربتوں نے اور شدت پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے ان کی شاعری کی قدر علماء فضلاء اور دانشور طبقہ ہی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔مفتی صاحب اس بنا پر غالب سے سخت نالاں اور ناخوش تھے مگر غالب کو مفتی صاحب کی کوئی پروانہ تھی لیکن مولانا کے مشورہ کے علاوہ ان کی صحبت اور شریک مجلس ہونے کی وجہ سے غالب کی سمجھ میں آ ہی گیا۔کہ ان کا کلام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے گا،تو مرزا پریشان بھی ہوئے اور انھوں نے اپنی روش بھی تبدیل کی۔یہ واقعہ مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں بھی بیان کیا ہے۔

مرزا غالب مولانا کی کس قدر عزت واحترام کرتے تھے اس کی تصدیق ان کے متعدد خطوط سے ہوتی ہے۔مرزا نے ایک خط میں مولانا کو خط نہ بھیجنے کی شکایت لکھی ہے اور ایک قصیدہ جو حمد میں عرفیؔ کے قصیدے کی طرز پر لکھا گیا تھا'' بھیجا اور مولانا سے اس کی داد کے بھی خواہاں ہوئے۔

یہ تو کہا ہی جا چکا ہے کہ مولانا کا وطن مالوف خیر آباد علم وادب کا مرکز بنا ہوا تھا اور مولانا دہلی پہنچے تو وہاں بھی چہار طرف باکمال حضرات کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔لہٰذا مولانا کو اور کیا چاہیے تھا،نتیجہ کے طور پر مولانا کے یہاں روز ہی نشست اور محفل جمنے لگی اور دہلی میں علماء وفضلاء کے دو مقام نشست کے لیے مخصوص ہو گئے۔ایک مولانا کے یہاں اور دوسرا مفتی آزردہ کی رہائش گاہ پر جبکہ مولانا کے دولت کدہ پر تو ہر آٹھویں دن شعرائے دہلی کی محفل ہوا کرتی تھی۔جن میں صہبائی،مومن۔آزردہ،احسان،نیر،نثار۔ شیفتہ،ضمیر۔ممنون اور نصیر وغیرہ کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔

یہ دربار کسی بھی شاہی دربار سے کم نہ تھا۔اکبر شاہ ثانی جیسے بادشاہ کو بھی اپنے دربار میں ایسی ہستیوں کی موجودگی کے لیے لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پڑتے تھے۔لیکن مولانا اور مفتی جیسے شاہان علم نے اپنے حسن اخلاق سے بے شمار نورتن اور باکمال حضرات کو اپنا گرویدہ درباری بنالیا تھا اور یہ مجلس کبھی

کسی سے قضا نہیں ہوتی تھی۔

مولانا نے جنگ آزادی 1857 میں باقاعدہ حصہ لیا تھا۔ آپ 16 / اگست 1857 کو بہادر شاہ ظفر کے پاس آئے تھے۔ جامع مسجد، دہلی سے جاری ہونے والا مشہور فتویٰ جہاد آپ ہی کے قلم کی دین تھا جس پر تقریباً 38 مشائخ وعلمائے ناموران نے دستخط کئے تھے حالانکہ اس فتویٰ پر مولانا کے اپنے دستخط نہیں تھے گو کہ مولانا نے یہ فتویٰ جاری کرنے سے قبل جمعہ کی نماز کے خطبہ میں ایک ولولہ انگیز تقریر کی تھی جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ نتیجہ کے طور پر سارے ہندوستان میں انقلاب کے لیے زبردست جوش وخروش پیدا ہو گیا تھا۔ حالانکہ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ اس فتویٰ کا مولانا سے کوئی سروکار ہی نہیں کیونکہ یہ مولانا کی دہلی آمد سے پہلے جاری ہو چکا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس پر مولانا کے دستخط نہیں ہیں۔

بہر حال مولانا دہلی آمد سے قبل 400 روپیہ ماہوار کے وظیفہ پر مہاراجہ الور کی ملازمت میں تھے۔ اس ملازمت کو ترک کر کے ہی وہ دہلی آئے تھے۔ مولانا کی شہرت کی وجہ سے بہادر شاہ ظفر مولانا کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ''تذکرہ جنگ دہلی'' میں مبارک شاہ جو مولانا کی دہلی آمد اور ان کے کردار کے چشم دید گواہ ہیں اس طرح رقمطراز ہیں۔

> ''مولانا فضل حق خیر آبادی جو کہ الور کے راجہ کی ملازمت میں 450 روپیہ ماہوار پر تھے، اب دہلی آگئے ہیں چونکہ مولوی صاحب اپنی فہم وفراست کی بنا پر پورے ہندوستان میں مانے جاتے تھے لہٰذا بادشاہ نے ان کو معاونین میں شامل کر لیا۔ ان کی آمد سے حکیم احسن اللہ خاں انتہائی ناخوش تھے کیونکہ حکیم احسن اللہ خاں کو خطرہ تھا کہ اتنے مشہور مولوی ضرور بادشاہ پر اثر انداز ہوں گے۔ لیکن فضل حق نے ازسرنو جہاد کا کوئی فتویٰ جاری نہ کیا اور نہ ہی بادشاہ کو غلط مشورہ دیا! گرچہ وہ اس کی مجلسوں میں ہوتے تھے۔''

غلط مشورہ سے یہاں مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا مشورہ نہیں دیا جس سے انقلاب کو

کسی قسم کا نقصان پہنچتا۔

مولانا نے فتویٰ جاری کیا تھا یا نہیں یا ان کی دہلی آمد سے قبل فتویٰ جاری ہو چکا تھا اس اختلاف رائے کے باوجود مولانا کے جنگ میں نظریاتی اور عملی کردار پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ انتہائی نازک حالات میں دہلی تشریف لائے تھے اور آتے ہی انقلابیوں کی حوصلہ افزائی شروع کر دی تھی جیسا کہ انگریزی جاسوسوں کے خطوط سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مبارک شاہ کے بیان کے مطابق نجف گڑھ کی شکست خوردہ انقلابی فوج جب دہلی واپس آئی تو اس کی خوراک کا انتظام مولانا نے ہی کیا تھا۔

یہاں پر انگریزی جاسوسوں کے خطوط کے چند اقتباسات ہیں جن سے مولانا کی عملی شرکت کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے:

1. مولانا فضل حق الور کے راجہ کی ملازمت چھوڑ کر دہلی آ گیا ہے۔
2. ایک ہفتے سے مولوی فضل حق، الور سے یہاں آئے اور تخریب زبانی عداوت سرکار شریک کورٹ کے ہوئے اور کل بیٹا ان کا ناظم سہارنپور مقرر ہوا اور مولوی میاں خان نائب سرشتہ دار گوڑگاؤں اور ہمشیرزاد مولوی صاحب بھی ناظم گوڑگاؤں مقرر ہوئے۔
3. الور کے مولوی فضل حق پچھلے ہفتے سے یہاں ہیں اور انگریزی حکومت کی شدت سے مخالفت اور دوسری ترکیبوں سے کونسل کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان کا لڑکا سہارنپور کا ناظم مقرر ہوا ہے۔۔
4. مولوی فضل حق جب سے دہلی آیا ہے شہریوں اور فوج کو انگریزوں کے خلاف اکسانے میں مصروف ہے۔ وہ کہتا پھرتا ہے کہ اس نے آگرہ گزٹ میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک اعلان پڑھا ہے کہ جس میں انگریزی فوج کو دہلی کے تمام باشندوں کو قتل کر دینے اور پورے شہر کو مسمار کر دینے کے لیے کہا گیا ہے۔

آنے والی نسلوں کو یہ بتانے کے لیے کہ یہاں دہلی کا شہر آباد تھا۔ شاہی مسجد کا صرف ایک مینار باقی چھوڑا جائے گا۔

5 ممکن ہے باغی آج انگریزی مورچوں پر حملہ کریں۔ مولوی فضل حق کے کہنے پر شہزادے ان حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ محاذ پر جاتے ہیں اور عموماً سبزی منڈی کے پل پر لڑتے ہیں۔

6 اگر آپ مرزا الٰہی بخش کو اس کے خط کا جواب دیں تو اس مقصد کے لیے وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے گا اور مولوی فضل حق اور دوسرے باغیوں کو شہر سے باہر نکال دے گا۔

7 ان کے علاوہ کونسل میں دہلی کے ہر ریجمنٹ کے پانچ پانچ سپاہی اور مولوی فضل حق بھی شامل ہیں۔۔۔

المختصر یہ کہ ان اقتباسات کے علاوہ بے شمار ایسی تحریریں موجود ہیں جن سے مولانا کی جنگ آزادی میں شرکت، سرگرمیاں اور دیگر کارروائیوں کا ثبوت ملتا ہے۔ مؤرخین کے بیانات علاحدہ ہیں۔ جیون لال اور لطیف کے علاوہ دیگر روزنامچوں میں بھی مولانا کا ذکر موجود ہے۔ جیون لال نے تو یہاں تک لکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی فضل حق کے پاس اپنی فوج بھی تھی۔ بہرکیف یہ کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا کہ مولانا نے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ مولانا کو قائد انقلاب یا مجاہد جلیل یوں ہی نہیں کہا جاتا۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ان کو بڑا مرتبہ حاصل تھا۔ وہ ہر منصوبے اور مشورے میں شریک رہتے تھے۔

مولانا نے اپنے والد علامہ فضل امام اور حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے تعلیم اور تربیت حاصل کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے مختلف علوم میں خاص مرتبہ حاصل کرلیا تھا اور یقیناً فن منطق میں ان کا علمی سرمایہ اجتہاد کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ ایک انتہائی خوشحال اور بااثر خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے ذرائع، رسوخ اور شہرت محض خیرآباد تک ہی نہیں محدود تھے۔ مولانا کا قیام بسلسلۂ ملازمت و دیگر مشغولیات دہلی، رامپور، الور، ٹونک، سہارنپور اور لکھنؤ میں بھی رہا تھا۔

مولانا کو بہادر شاہ ظفر بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے جس کا اندازہ ذیل میں بیان کیے گئے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے:

''دہلی سے جھجر روانگی کے وقت بہادر شاہ ظفر نے اپنا ملبوس دوشالہ علامہ کو اوڑھایا اور آبدیدہ ہوکر کہا چونکہ آپ جانے کو تیار ہیں میرے لئے بجز اس کے کوئی چارۂ نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کروں مگر خدا علیم ہے کہ لفظ ''وداع'' زبان پر لانا دشوار ہے۔''

مرزا غالب نے بھی اپنے ایک خط میں اس المناک دردِفراق کا حال لکھا ہے۔ یہ خط طویل بہت ہے اور مولوی سراج الدین کو لکھا گیا تھا۔ اس خط سے مرزا غالب کا علامہ سے بے پایاں خلوص اور غمِ ہجر ظاہر ہوتا ہے اور بے پناہ خلوص و محبت کا ثبوت بھی اس طرح کے احساسات کا اظہار غالب کے اس خط سے بھی ہوتا ہے، جو انھوں نے مولانا کے گھر کے قریب آگ لگنے پر مولانا کو لکھا تھا۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے دہلی میں مولانا کے مرزا غالب اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ سے ہم جان و ہم قالب والے تعلقات تھے۔ جس طرح جسم اپنے ابعاد کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا اسی طرح ان تینوں حضرات کو جسم خلوص و محبت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تاریخ داستان انقلاب 1857 میں مولانا کی شخصیت، کردار اور علم و فضل کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ایک مفصل اور ضخیم کتاب لکھی جانی چاہیے لیکن بدقسمتی سے مولانا ایک زود فراموش قوم کے فرد تھے لہٰذا فراموش کردیئے گئے اور عین ممکن ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد مولانا کا نام لینے پر لوگ حیرت سے دریافت کریں کہ یہ حضرت کون تھے؟ مولانا جیسی ہستیاں کسی قوم یا ملک کو روز روز نہیں بلکہ صدیوں کے بعد نصیب ہوتی ہیں۔

غدر کے بعد لاتعداد سورما ایسے تھے جو گوشۂ عافیت کی تلاش میں یہاں سے وہاں سرگرداں تھے لیکن مولانا ان لوگوں میں تھے جو اپنی کارکردگی پر قطعی نادم یا پریشان نہیں تھے کیونکہ انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر جنگ آزادی کے میدان میں قدم رکھا تھا اور وہ اپنے اعمال و اقدامات کے نتائج کا خمیازہ بھگتنے کے لئے حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ خوف و سراسیمگی یا دہشت جیسے جذبے سے وہ قطعی ناواقف اور لاعلم تھے۔

مولانا ستمبر 1857 میں بمشکل تمام بچتے بچاتے اودھ پہنچے اور پھر خیرآباد جہاں سے انھیں

گرفتار کر کے لکھنو لایا گیا۔ وہیں 1859 میں ان پر دائر کیے گئے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی اور چند ہی پیشیوں کے بعد 4/مارچ1859 کو مولانا کو عمر قید بعبور دریائے شور بحیثیت قیدی سرکار انگلشیہ اور ضبطی جائداد کی سزا دی گئی اور انھیں جزائر انڈمان بھیج دیا گیا جہاں 12/صفر1278ھ مطابق 1861 میں ان کا انتقال ہوا۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور

مولانا کی باعزت رہائی بھی ممکن تھی کیونکہ عدالت میں انصاف کی کرسی پر بیٹھا ہوا ایک جج آپ سے کام بھی سیکھ چکا تھا لہٰذا مولانا سے ہمدردی رکھتا تھا۔ یہی کیفیت جیوری کی بھی تھی۔ دوسرے یہ کہ مولانا کا ایک ہمنام جو شاہجہانپور کا رہنے والا تھا اور 1857 کا ملزم تھا اور مفرور بھی تھا۔ مولانا کے خلاف لگائے گئے الزامات اس کے سر تھوپے جاسکتے تھے جیسا کہ وکلاء وعدالت نے رجحان بھی اختیار کرلیا تھا لیکن مولانا کی سچائی اور صداقت پسندی انھیں لے ڈوبی۔

علامہ کی قبر انڈمان کے ساؤتھ پوائنٹ میں ہے۔ اس مقام کو عرف عام میں نمک بھٹہ کہتے ہیں جو ایک بستی میں واقع ہے اور جس کا ایک سمندری کنارہ "Ross" جزیرہ سے قریب ہے۔ یہ وہی جزیرہ ہے جہاں پر علماء قیدیوں سے لدے ہوئے اسٹیمر یا جہاز لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ یہیں پر مولانا کی قبر کے پاس ہی مولانا لیاقت علی الہ آبادی کی قبر بھی ہے۔ یہاں پر ایک المیہ کا تذکرہ ضروری ہے۔ مولانا کے صاحبزادگان ماشاء اللہ بڑے بااثر اور بارسوخ تھے۔ وہ متواتر مولانا کی رہائی کے لئے کوشاں رہے خصوصاً مولوی شمس الحق دہلوی اور مرحوم علامہ کے قریبی عزیز خان بہادر مفتی انعام اللہ گوپاموی کے داماد منشی خواجہ غلام غوث بے خبر و خان بہادر ذوالقدر میر منشی لیفٹیننٹ مغربی وشمالی صوبۂ اودھ سے مولانا کی رہائی کے لیے رابطہ قائم کیے ہوئے تھے جن کی کوششوں سے پروانۂ آزادی حاصل بھی ہوگیا اور مولوی شمس الحق، انڈمان کے لئے روانہ ہوگئے تاکہ والد محترم کو واپس ہندوستان لاسکیں۔

مولوی شمس الحق صاحب بحری جہاز سے کالا پانی کی سطح زمین پر قدم رکھتے ہیں اور شہر میں داخل ہوتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جنازہ جارہا ہے جس کے ساتھ ایک ازدہام تھا۔ دریافت کرنے

پر معلوم ہوا کہ کل یعنی 12/ صفر 1278ھ کو علامہ کا انتقال ہوگیا۔ اب سپرد خاک کرنے جارہے ہیں۔ مولوی شمس الحق صاحب پر کیا گذری ہوگی اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ بہر کیف یہ ہمراہ ہوگئے اور بعد دفن و فاتحہ بصد حسرت و یاس واپس وطن لوٹ آئے۔

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند

دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

مولانا ایک یگانۂ روزگار عالم تھے اور عربی زبان کے مانے ہوئے ادیب و شاعر ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ تصانیف کی تعداد میں لوگوں کا خیال ہے کہ یہ 40 سے کم نہیں۔ مولانا نے عربی زبان میں ''الثورۃ الہندیہ'' اور ''قصائد فتنۃ الہند'' جیسے رسائل کالے پانی ہی میں تحریر کئے تھے جو بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی ''باغی ہندوستان'' کے عنوان سے ان دونوں رسائل کا اردو ترجمہ بمعہ بیش بہا اضافوں اور حواشی کے شائع کراچکے ہیں۔ اب تک اس کے 5 ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

''باغی ہندوستان'' معلومات کا خزانہ ہے۔ جس میں 1857 کے حالات اور واقعات کے مختلف پہلو نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس کتاب سے جنگ آزادی میں تیموریہ شہزادوں کے کردار، تعیش پسندی، عسکری کمزوریوں، انگریزوں کے ساتھ ساز باز اور دیگر ذاتی بغض وعناد اور اپنی اپنی مقصد براریوں، بدعنوانیوں اور بداخلاقیوں کے لئے کی جانے والی سازشوں کا بھی انکشاف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جس انداز سے مولانا نے بہادر شاہ ظفر کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے انقلاب کے مرکزی کردار ہونے کی حیثیت سے بہادر شاہ ظفر کے منفی پہلو غور طلب ہوجاتے ہیں۔

اس کے علاوہ مولانا کے تحریر کردہ ان دو رسائل سے کالے پانی کے قیدیوں کے ساتھ کئے جانے والے مظالم اور جبر و تشدد، انتقاماً دی جانے والی تکلیف دہ سزائیں اور انسانیت سوز بدسلوکیوں کی ایسی داستانیں سامنے آتی ہیں جن کے پڑھنے سے ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مولانا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں موت کو خود ہی گلے لگالیتا کیونکہ وہ میرے لئے ایسی زندگی سے

کہیں زیادہ آرام دہ اور پرسکون ثابت ہوتی۔ ان کے اس بیان کی توثیق جیمز پیٹی سن واکر کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ یہ ظالم انگریز پہلے آگرہ جیل کا جیلر ہوا کرتا تھا اور کالا پانی کا پہلا جیلر تھا بلکہ حکمراں تھا۔ وہ قیدیوں سے کہا کرتا تھا۔

''ہوسکتا ہے کہ اس کائنات کا خدا کہیں موجود ہو لیکن تمھارے لئے یہاں کا خدا میں ہوں۔''

لیکن کچھ مورخین کا خیال ہے کہ خدائی کا یہ فرعونی دعویٰ کرنے والا جیلر جیمز پیٹی سن واکر نہیں تھا بلکہ ڈیوڈ بیری تھا۔

یہاں پر ایک اور واقعہ کا ذکر باعث دلچسپی ہوگا اس لئے اس کا بیان ضروری ہے۔:

مولانا نے یہ دونوں مذکورہ بالا رسائل کالا پانی میں عربی زبان میں کاغذ کے پرزوں اور کپڑوں کے ٹکڑوں پر کوئلہ اور پنسل وغیرہ سے لکھے تھے جو بڑی خستہ حالت میں تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ مفتی عنایت احمد کاکوروی بھی جنگ آزادی 1857 کے ہی جرم میں مولانا کے ساتھ ہی قید و بند کی مصیبتیں جھیل رہے تھے اور یہ ایک اتفاقیہ خوش قسمتی تھی کہ مفتی صاحب کو رہائی حاصل ہوگئی اور وہ عازم ہندوستان ہوئے تو مولانا نے دونوں رسائل کے مسودے ان کے ذریعہ اپنے خلف مولانا عبدالحق خیرآبادی کو بھیج دیے اور عبدالحق صاحب نے بڑی محنت اور کاوش سے ان رسائل کو مرتب کیا اور چند مخلصین نے اس کی نقلیں اپنے پاس محفوظ رکھیں لیکن حکومت کے خوف سے اس کی اشاعت کی کوئی بھی جرأت نہ کرسکا۔ نتیجہ کے طور پر اس کے اردو ترجمے کا پہلا ایڈیشن 1947 ہی میں منظر عام پر آسکا جس کا اہتمام مدینہ پریس بجنور نے کیا تھا اور اب تک 5 ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے۔

سو گئے رخ موڑ کے جو گردشِ ایام کا دہر میں بجتا ہے ڈنکا آج ان کے نام کا

جزائر انڈمان نکوبار کا کوئی بھی قبرستان ہو وہاں کسی نہ کسی تاریخ ساز ہستی کا مدفن ضرور ہوگا چاہے اس کے نشان نہ ہوں لیکن اس شہر خموشاں کی خوش قسمتی کا کیا عالم ہوگا جسے خالق کائنات نے

مولانا فضل حق خیر آبادی کی آخری آرام گاہ کے لئے منتخب کیا ہو۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

جنھیں پھر گردش افلاک پیدا کر نہیں سکتی
کچھ ایسی ہستیاں بھی دفن ہیں گور غریباں میں

مولانا کے انجام پر چند لوگوں کے احساسات اور جذبات کا اظہار بھی یہاں ضروری ہے۔
جب مولانا جیسا آفتاب علم وعمل دیار غربت میں غروب ہوگیا تو مولانا عبداللہ بلگرامی کا قلم بے ساختہ کہہ اٹھا:

فضل ان کے کفن میں مکفون اور علم ان کے ساتھ مدفون ہوگیا

مولانا فضل حق غالب کے سب سے بڑے محسن تھے، انھوں نے نہ صرف مرزا کی شعروسخن میں رہنمائی کی جوان کا اصل دائرہ عمل تھا بلکہ ان کی مالی مشکلات دور کرنے کی بھی ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ غالب مولانا کے سانحہ ارتحال پر شیخ لطیف احمد بلگرامی کو لکھتے ہیں:

'' کیا لکھوں اور کہوں۔ نور آنکھوں سے جاتا رہا اور دل سے سرور۔ ہاتھ میں رعشہ طاری ہے۔ کان سماعت سے عاری ہے۔

عتاب عروساں در آمد بجوش
صراحی تہی گشت وساقی خموش

فخر ایجاد وتکوین مولانا فضل حق جیسا دوست مرجائے غالب نیم مردہ جان رہ جائے۔

☆☆☆

ڈاکٹر ارجمند آرا

غالب کا ایک ممتاز اسکالر اور مترجم۔ رالف رسل

یوروپی اسکالرز نے اردو کے جن شعراء کو سب سے زیادہ اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے وہ غالب اور اقبال ہیں۔ مطالعہ اقبال میں دلچسپی کا سبب اس عہد کے سیاسی حالات اور اقبال کا وہ مربوط فکری نظام ہے جسے وہ اپنی شاعری کے ذریعے عام کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال کی شخصیت ایک قائد اور رہنما کے طور پر پہچانی جاتی ہے، ان کے فلسفے میں مملکت خداداد کا جواز ڈھونڈا جاتا ہے اور پاکستانی قوم انہیں اپنے ملک کا بانی نظریہ ساز سمجھتی ہے۔ پاکستان کی تشکیل کا معاملہ ہو یا بر صغیر میں مسلمانوں کے لامتنہی زوال کا سوال، ہر دو اعتبار سے اقبال ایک عظیم رہنما، دانشور اور حکیم الامت قرار پاتے ہیں۔ برصغیر کے اس دور کے سیاسی اور ادبی مطالعات اقبال کے ذکر کے بغیر ادھورے ہیں۔

غالب سے دلچسپی کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔۔ اول یہ غالب کی شاعری مضمون آفرینی، معنوی تہ داری، تخلیقی وفور، جدت پسندی اور پیچیدہ طرز اظہار سے مملو ہے جس کا مطالعہ پڑھنے والے کی فکر اور تجسس کو انگیخت کرتا ہے، ساتھ ہی ان کی پر ہنگام زندگی، شگفتہ اور سحر انگیز شخصیت بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ شیکسپیئر کے ٹریجک ہیرو کی طرح وہ بھی اعلی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، شراب نوشی اور جوا کھیلنا وہ المیاتی عیب ہیں جن کے نتیجے میں المیہ واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، مثلاً ان کا مقروض ہونا اور جیل جانا، معاشی پریشانیوں کو حل کرنے کی کوشش میں سفر کی صعوبتیں برداشت کرنا وغیرہ۔ دست قدرت بھی ان کی زندگی کو مزید الم انگیز بناتا ہے اور یکے بعد دیگرے ان کی سات اولادیں ایام طفلی میں ہی فوت ہو جاتی ہیں۔ بیوی کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے بھی اشارے ملتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں مل کر غالب کی شخصیت کو المیہ ہیرو کی طرح پر کشش بنادی تی ہیں، اس پر مستزاد یہ کہ غالب کی طبعی ظرافت اور

شوخی جب شعر پر غالب ہوتی ہے تو قاری بیک وقت کومک ٹریجک صورت حال سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ وہ وصف ہے جو کسی اور شاعر کے ہاں نہیں ملتا۔

غالب سے پہلے اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس کے حالات زندگی سے ہم اس حد تک واقف ہوں کہ وہ جیتے جاگتے شخص کی طرح ہماری سائیکی کا حصہ بن جائے۔ ان کی شاعری اور شخصیت دونوں کا ہندوستان بھر میں اس قدر شہرہ تھا کہ یوروپی اسکالران کو نظر انداز نہ کر سکتے تھے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ غالب ایک پرآشوب تاریخ کے موڑ پر کھڑے اور جدید دور میں داخل ہونے کو تیار ہندوستان میں ہماری قدیم تہذیبی روایت کے ترجمان لیکن جدید ذہن کے حامل شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کی زندگی اور تخلیقات، خصوصاً مکتوبات کا مطالعہ دراصل تاریخ کے اس اہم دور کا بھی مطالعہ بن جاتا ہے جب نشاۃ ثانیہ والی یوروپی تہذیب 1857 کے راستے سے ہر فاتح تہذیب کی طرح ہندستان کی قدامت پسند روایتی زندگی پر اثر انداز ہوئی۔ غالب کی روداد دلی کے اشرافیہ طبقے کو درپیش مسائل کا استعارہ بن جاتی ہے۔

چنانچہ مستشرقین نے ان دونوں شعراء کو جس طرح وسیع تر مطالعے کا موضوع بنایا ہندوستان کے کسی اور شاعر کو نہیں۔ غالب کو تفصیلی مطالعے کا موضوع بنانے والے یوروپی اسکالرز میں سب سے اہم نام رالف رسل کا ہے۔ ان سے قبل ہندوستانی ادبیات کی Anthologies میں غالب کی شاعری کے نمونے تو ملتے ہیں لیکن باقاعدہ کتابیں نہیں۔ غالب پر جن لوگوں کے مطالعات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ان میں رالف رسل کے علاوہ پروفیسر این میری شمل اور پروفیسر فرانسس پریچٹ کے نام بھی اہم ہیں۔ پروفیسر شمل نے غالب کی شاعری کو فارسی کی قدیم روایت سے مربوط کر کے اسے اپنے مطالعے کا موضوع بنایا۔ غالب کی شاعری میں رقص اور شرر کے پیکروں پر انہوں نے وقیع کام کیا اور فارسی کے عظیم کلاسیکی سرمایے میں اس کی بنیادوں کی تلاش کی۔ ان کا یہ مطالعہ پروفیسر قاضی افضال حسین نے اردو میں ترجمہ کر کے 'رقص شرر' کے عنوان سے غالب اکاڈمی سے شائع کرادیا ہے۔

رالف رسل کی حیثیت یقیناً غالب کے ایک معتبر اسکالر کی ہے۔ انہوں نے غالب کا مطالعہ ابتدا ہی

سے بڑی سنجیدگی اور گہرائی سے کیا تھا۔ ایک ایسے غیر اردو داں کے لئے جو اردو تہذیب اور شاعری کی نزاکتوں اور روایتوں سے پوری طرح واقف نہ ہو غالب جیسے مشکل پسند شاعر کو سمجھنا جوئے شیر لانے سے کم نہ رہا ہوگا۔ غالب کے مفاہیم تک پہنچنے میں وہ جس غور وفکر کے مرحلے سے دوچار ہوئے ہوں گے اور غالب نے ان پر خود کو جس طرح بتدریج آشکار کیا ہوگا وہ یقیناً رالف رسل کے لئے ایک نشاط انگیز روحانی تجربہ رہا ہوگا، غالب کو تفہیم کے مرحلے کو انھوں نے پروفیسر خورشید الاسلام کی مدد سے جس طرح عبور کیا اس کا اندازہ ان کے بہترین ترجموں سے ہوتا ہے۔ ان دونوں کا علمی اشتراک تقریباً چالیس برسوں کو محیط ہے جس کے نتیجے میں دو کتابیں منظر عام پر آئیں، Three Mughal Poets جس میں میر، سودا اور میر حسن کا مطالعہ شامل ہے اور دوسری Ghalib: Life and Letters چار سو صفحے پر مشتمل اس کتاب میں غالب کے اردو اور فارسی مکتوبات میں مذکور واقعات کی مدد سے ان کی سوانح عمری ترتیب دی گئی ہے۔ غالب شناسی میں یہ بنیادی اہمیت کی حامل کتاب تصور کی جاتی ہے اور مغربی دنیا کے ساتھ غالب کا پہلا بھرپور تعارف کراتی ہے۔ مرتبین نے غالب کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے واقعات کو سترہ ابواب میں ترتیب دیا ہے جس میں 1857 سے 1867 تک کی روداد سال بہ سال الگ الگ ابواب میں مرتب کی ہے۔ اٹھارہ سو ستاون کی ہنگامہ خیزیوں نے دہلی اور غالب کو جس طرح متاثر کیا تھا، اس سے غالب کی ذہنی زندگی یکسر بدل گئی تھی۔ اس کی تفصیلات ان کے خطوط میں جابجا موجود ہیں، ان تمام واقعات کا سال بہ سال مطالعہ مرتبین، درست ہی، لازمی محسوس کیا۔ اس کتاب میں غالب کے خطوط پر وضاحتی نوٹ اور ان لوگوں کا تعارف بھی شامل ہے جن کے نام غالب نے خط لکھے۔ مثلاً لوہارو کے نواب علاء الدین خاں علائی، سکندر آباد کے منشی ہرگوپال تفتہ، لکھنؤ کے حاتم علی بیگ مہر، اورنگ آباد دکن کے میاں داد خاں سیاح، مارہرے کے چودھری عبدالغفور سرور اور بنارس کے خواجہ غوث خاں بے خبر پر دل چسپ تعارفی نوٹ شامل کتاب ہیں۔ حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ میر مہدی مجروح پر، جن کو غالب نے بہت سے خط لکھے، مرتبین کو 'تلامذۂ غالب' از مالک رام اور 'خطوط غالب' مرتبہ غلام رسول مہر کے حواشی سے بھی کوئی ایسی معلومات فراہم نہ ہو سکی جس کی بنیاد پر وہ

مجروح کا تعارف لکھ سکتے۔

رالف رسل نے غالب پر مزید پانچ کتابیں شائع کیں۔ ان میں غالب کی منتخبہ اردو اور فارسی شاعری اور خطوط کے تراجم کے علاوہ، ان کی شاعری، مکتوب نگاری، عہد، اس عہد کی دلی اور غالب شناسی پر اہم تجزیاتی اور معلوماتی مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے دو کتابیں غالب کی فارسی اور اردو شاعری کے ترجموں پر مشتمل ہیں جو پاکستان سے شائع ہوئیں۔ پہلی selections from the Persian Ghazals of Ghalib with Translations ہے جس میں غالب کی منتخبہ فارسی شاعری کا اردو اور انگریزی ترجمہ شامل ہے۔ یہ کتاب 1997 میں انجمن رقی اردو پاکستان نے شائع کی۔ منظوم اردو ترجمہ افتخار احمد خاں عدنی نے کیا ہے اور رالف رسل نے انگریزی ترجمہ۔ ان کے تقابلی مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے پیچیدہ مضامین کی ترسیل میں رالف رسل جتنے کامیاب ہیں، زبان داں ہونے کے باوجود عدنی صاحب کی رسائی ان تک نہیں ہو سکی ہے۔ دوسری کتاب The Seeing Eye ہے جو الحمرا نے اسلام آباد سے سنہ 2003 میں چھاپی۔ اس میں غالب کی اردو اور فارسی کی منتخب غزلوں کا ترجمہ دونوں متون کے ساتھ شامل ہے۔ یہ ایک ضخیم انتخاب ہے جس میں اصل متن اور ترجمہ شدہ انگریزی متن چار سو صفحات کو محیط ہے۔ اس کتاب پر رالف رسل نے ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک پروجیکٹ کے تحت کام شروع کیا تھا جس کے لئے انہوں نے پروفیسر خورشید الاسلام کو اپنا رفیق کار بنایا لیکن کسی سبب سے یہ اشتراک قائم نہ رہ سکا اور رسل نے تنہا ہی اس کام کو انجام تک پہنچایا۔ انہوں نے غالب کی جتنی بھی شاعری کا ترجمہ اپنی زندگی میں کیا وہ سب کا سب اس کتاب میں شامل ہے۔ ایک اور کتاب The Famous Ghalib ہے جو رولی بکس نے 2000 میں دہلی سے شائع کی۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اردو کے ساتھ دیوناگری اور رومن متن بھی شائع کیا گیا ہے۔ نصف کتاب ترجموں پر اور بقیہ نصف غالب کے حوالے سے دو طویل مضامین پر مشتمل ہے۔ 1997 میں رسل نے غالب کی شاعری اور عہد پر ایک کتاب Ghalib: The Poet and His Age بھی مرتب کی تھی۔ غالب پر ان کی آخری کتاب 2003 میں Ghalib: Life, Letters and Ghazals

کے عنوان سے شائع ہوئی۔ 672 صفحوں پر مشتمل آکسفورڈ کی اس خصوصی اشاعت میں غالب کے سوانحی حالات، ان کا عہد، اردو اور فارسی شاعری کے تراجم اور ان پر مضامین اس طرح سے یکجا کیے گئے ہیں غالب کی نجی زندگی اور ادبی سفر کی ایک مکمل تصویر قارئین تک پہنچ سکے۔ اس میں عہد غالب کی دہلی پر پرسیول سپئیر Percival Spear اور فارسی شاعری پر اے. بوسانی A.Bausani کے مضامین بھی شامل ہیں۔ اس کتاب میں دراصل رالف رسل نے غالب پر اپنے گزشتہ تمام کام کو حسب ضرورت اختصار کے ساتھ یکجا کیا ہے لیکن ساتھ ہی شعری تراجم والے حصے میں اضافے بھی کیے ہیں۔

ترجموں کے علاوہ رالف رسل نے غیر اردو دانوں کے لئے تفہیم غالب سے متعلق رہنمایانہ مضامین بھی لکھے۔ مثلاً ان مضامین میں انہوں نے اردو غزل اور غالب کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی، ان کی شاعری کے تہذیبی اور فکری پس منظر پر ضروری واقفیت بہم پہنچائی، غالب کا پیغام، ان کی فکر کے بنیادی عناصر اور ان کے اسلوب کی خصوصیات سے قاری کو متعارف کرایا تا کہ ترجمے سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس کی ضروری تربیت ہو جائے اور وہ اس کے وسیع تر مضمرات اور معنیاتی نظام کو سمجھ سکے۔

غالب کے مترجم کی حیثیت سے رالف رسل کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ آکسفورڈ میں طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے قدیم یونانی اور لاطینی ادب کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ کلاسیکی ادب کے مطالعے کا ان کا ذوق تربیت یافتہ تھا، اسی تربیت نے اردو اور سنسکرت ادبیات کے مطالعے میں ان کی مدد کی۔ ان کا طرز فکر خاصا منطقی تھا اور معروضیت کو انہوں نے اپنا شعار بنایا جس کی کارفرمائی ان کے ترجموں میں بھی نظر آتی ہے۔ ادب کے تراجم کے سلسلے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ مترجم اپنی مادری زبان میں زیادہ اچھا ترجمہ کرسکتا ہے اور جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہے اس کی معقول واقفیت کے باوجود ضروری نہیں کہ وہ اس کی ساری نزاکوں اور تہذیبی انسلاکات سے بخوبی واقف ہو، چنانچہ اس پر لازم ہے کہ اس زبان کے بولنے والے شخص کی مدد بھی حاصل کرے۔ اسی واضح فکر کے ساتھ انہوں نے پروفیسر خورشید الاسلام کو اپنا شریک کار بنایا تھا۔

رالف رسل کے ان ترجموں، وضاحتی نوٹس، حواشی اور مضامین کا مقصد کہیں بھی کسی عالمانہ بحث میں پڑنا نہیں ہے، نہ ہی انہوں نے انگریزی یا دوسری زبانوں میں موجود غالب کے تراجم اور مطالعات کا جائزہ لیا ہے، بلکہ ایسے کسی کام کی طرف اشارہ تک نہیں کیا ہے۔ چنانچہ جو لوگ غالب کے حوالے سے عالمانہ مباحث کی تلاش میں ان کا مطالعہ کرنا چاہیں گے انہیں سخت مایوسی ہوگی۔ لیکن جن لوگوں کا بنیادی مقصد صرف اور صرف غالب کو پڑھنا اور سمجھنا ہے، ان کے لئے رالف رسل بہترین مترجم اور رہ نما ہیں۔ ان کا واحد مقصد بغیر کسی ابہام کے، پوری دیانت داری کے ساتھ غالب کو انگریزی میں پیش کر دینا ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک سہل کام ہے لیکن غالباً سب سے مشکل بھی کہ مترجم اپنے انداز فکر اور وجود کو بھول کر، اس شاعر کے ذہن میں اتر جائے جس کا وہ ترجمہ کر رہا ہے۔ غالب کی شخصیت اور شعری مفاہیم تک خود کو محدود رکھنا ان کے کام کی خوبی ہے، نقص نہیں۔ اگر وہ بھی غالب کی عالمانہ تشریحات اور دیگر مباحث کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے تو شاید اتنے اچھے مترجم نہ بن پاتے جو کہ وہ ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ترجمہ ایک مشکل کام ہے، شاعری کا تو اور بھی مشکل۔ اس میں آپ شعر کا مفہوم تو منتقل کر سکتے ہیں لیکن اس کی تخلیقیت نہیں۔ اس کا حسن اور فنی روح نہیں۔ اس کے بغیر ترجمہ شدہ نظم محض فکر بن کر رہ جائے گی یا سادہ بیان۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ادیب اور مترجمین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شاعری کا ترجمہ ناممکن ہے۔ غالب کی شاعری کا ترجمہ اور بھی مشکل ہے جس کے یہاں مفاہیم میں بے اندازہ تہ داری ہے۔ ایک بظاہر سادہ سا شعر بھی کئی کئی مفاہیم رکھتا ہے۔ ترجمہ کسی ایک مفہوم تک رسائی کر سکتا ہے، اس کے تمام رمز نہیں کھول سکتا۔ اگر ترجمے میں ان سب کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ تشریح کے زمرے میں آئے گی ترجمے کے نہیں۔ چناچہ رسل کو یہ مشکل درپیش تھی کہ غالب کے کون سے اشعار لیں اور کون سے چھوڑ دیں۔ انتخاب کے لئے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جو اشعار مفہوم سے زیادہ اپنے طرز ادا کے سبب پہچانے جاتے ہیں، ان کا ترجمہ نہ کیا جائے۔ لیکن جو مفہوم کے اعتبار سے اہم ہیں اور جن کی ترسیل بھی قدرے آسان ہے ان کا ترجمہ کیا جائے۔ اس کے باوجود چونکہ زیادہ تر اشعار غالب کی ندرت فکر اور جدت طبع کے غماز ہیں، اس لئے ان کی تفہیم آسان نہیں۔ پھر بھی رالف

رسل نے کوشش کی ہے کہ انگریزی ترجمے میں بھی زبان و بیان کی دونوں خوبیاں برقرار رہیں۔ صرف ایک دو مثالوں پر اکتفا کروں گی۔ غالب کا ایک بہت مشہور شعر ہے:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　　گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

یہ شعر بہ ظاہر جتنا سادہ نظر آتا ہے اتنا ہے نہیں۔ اس سے کم از کم دو مفہوم برآمد ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ محبوب کے لب اتنے شیریں ہیں کہ اس کے منہ سے نکلنے والی گالیاں بھی شیریں ہو جاتی ہیں اور انہیں سن کر رقیب بدمزہ نہیں ہوتا۔ اس مفہوم میں رقیب کے بدمزہ نہ ہونے پر افسوس کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ دوسرا مفہوم، جس کی وجہ سے غالب نے شعر کہا ہوگا، یہ ہے کہ رقیب نے محبوب کے لبوں کا بوسہ لیا، جن کی شیرینی کا یہ عالم ہے کہ اس کے بعد میری یا لوگوں کی گالیوں کا کوئی اثر رقیب پر نہیں ہوا۔ اس کے منہ کا ذائقہ نہیں بدلا کیونکہ محبوب کے لبوں کی شیرینی اس کے دہن میں سے ابھی تک باقی ہے۔ رالف رسل نے اس شعر کا ترجمہ یوں کیا ہے:

How sweet your lips must be! Even my rival
Reslished the insults they bestowed on him.

ترجمے میں لفظ they کا استعمال ویسے ہی محاورے میں کیا گیا ہے جیسے ہم 'انہوں نے گالیاں دیں' کے بجائے 'اس پر گالیاں پڑیں' کہیں۔ اس طرح غالب کی طرح رسل نے بھی گالیاں دینے والے کی ہستی کو پوشیدہ رکھا ہے۔ ایک اور شعر ہے:

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور　　رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

رالف رسل نے یوں ترجمہ کیا ہے:

He took my life in foreign lands, far from my own country.
Thanks be to God, who saved me from the shame of friendlessness.

اس شعر میں لفظ بے کسی کا ترجمہ انہوں نے friendlessness کیا ہے، یہاں اگر وہ مفہوم کے بجائے لفظی ترجمہ helplessness کرتے تو اس کا مطلب غیر اردو داں کے پلے ہی نہیں پڑتا۔

رالف رسل کوشش کرتے ہیں کہ ترجمے میں وضاحتی لہجہ اختیار نہ کرنا پڑے۔ وہ شعر کے مصرعوں کی طرح کم سے کم الفاظ میں ترجمہ کرتے ہیں، مثلاً یہ ترجمہ دیکھیں:

The tavern is no more. What does it matter where I drink
Be it the mosque, the seminary, or the hermitage.

ترجمہ پڑھ کر ذہن فوراً اصل شعر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے: جب مے کدہ چھٹا تو۔۔۔۔اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی زائد لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن کچھ اشعار کے ترجمے وضاحت طلب ہوتے ہیں۔ ایسے میں رسل ترجمے سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے بجائے حاشیے میں وضاحتی نوٹ لکھتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر دیکھیں:

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اس کے ترجمہ یوں کرتے ہیں:

You, who gaze in the mirror, look at me
And see the longing gaze I turn on you.

ترسیل کے اعتبار سے انہیں ترجمہ مکمل نہیں لگتا چنانچہ وضاحت کی غرض سے حاشئے میں نوٹ لکھتے ہیں: محبوب کا حسن دیکھ کر آئینہ سحر زدہ ہو کر اسے دیکھتا رہ جاتا ہے، لیکن میں آئینے سے کہیں زیادہ مسحور ہوں۔ (The mirror is said the gaze spellbound at the beloved's beauty. But hte impact on me is even greater.)

اس طرح وہ اپنے ترجموں میں حسب ضرورت لچک پیدا کرتے ہیں، کہیں کہیں وضاحتی انداز اختیار کرنے کے باوجود کوشش کرتے ہیں کہ غالب کے شعر کہنے کے انداز کو حتی الامکان مجروح نہ ہونے دیں۔ مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں لیکن مقصد غالب کے اس اہم مترجم کے کام کا تنقیدی جائزہ لینا نہیں بلکہ غالب کے حوالے سے اعتراف کرنا ہے۔ رالف رسل ادب اور تہذیب کے ایک پرتجسس اور پرجوش طالب علم تھے۔ وہ اردو زبان و تہذیب کے جن پہلوؤں سے متاثر ہوئے ان پر لکھا بھی اور کھلے دل سے اعتراف بھی کیا۔ اپنی سوانح عمری Findings, Keepings میں وہ واضح الفاظ میں یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اردو شاعری کے مطالعے نے ان کا انداز فکر بدلا، خصوصاً سچی انسانیت کی بنیادی خصوصیت

کے طور پر محبت کے جذبے کا اعرفان انہیں اردو کے مطالعے سے ہوا، وہ لکھتے ہیں:

> اردو شاعری کے مطالعے نے اس احساس کو واضح کرنے میں مدد کی کہ انسان بننے کے لئے محبت کرنا بنیادی طور پر لازمی ہے اور یہ کہ ایک معنی میں یہ بات غیر اہم ہے کہ آپ کس سے محبت کرتے ہیں اور اس کے اظہار کے کتنے مواقع آپ کو ملے ہیں، بنیادی بات تو محبت کرنا ہے۔

رالف رسل نے انسانوں سے ہی نہیں، اپنے ادبی مشاغل، اپنے کمیونسٹ طرز فکر اور اپنے آپ سے بھی اسی وفاداری اور استواری کے ساتھ آخری سانس تک محبت کی جس کا عرفان انہیں اردو شاعری کے مطالعے سے ہوا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر مسرت جہاں

انقلاب 1857 اور غالب کے خطوط

انقلاب 1857 سے متعلق بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے۔ یہ وہ تاریخ ہے جس سے ہندوستانی ناواقف نہیں ہیں۔ خصوصاً تاریخ کی کتابیں اس موضوع کے حوالے سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن غالب نے اپنے خطوط میں جس باریکی سے اس عہد کی دلی کی اور دلی والوں کی پریشان حالی کا ذکر کیا ہے ان کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے، رشتوں کی پامالی کا نوحہ پڑھا ہے اور مٹتی ہوئی تہذیب کا بیان کیا ہے۔۔۔ اس کی مثالیں کہیں اور نہیں ملتیں۔ غالب کے خطوط مکمل طور پر اپنے عہد کا آئینہ ہیں۔

غالب کی بنیادی شناخت ایک شاعر کی حیثیت سے ہے تاہم نثر میں بھی ان کا مقام کافی بلند ہے اور یہ ان کے خطوط کی وجہ سے ہے۔ پیش نظر مضمون میں انقلاب 1857 سے متعلق غالب کے جذبات تجربات اور مشاہدات پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کا اظہار غالب نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ مئی 1857 میں برپا ہونے والی یہ مسلح جدوجہد حصول آزادی کی ایک انقلابی جدوجہد بھی ہے۔ یہ انقلاب انگریزوں کی نظر میں غدر اور ہندوستانیوں کے نقطہ نگاہ سے پہلی جنگ آزادی ہے۔ پون کمار ورما نے اپنی مقبول کتاب 'غالب شخصیت اور عہد' میں اس انقلاب کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

> ''میرٹھ کے سپاہیوں کی پہلے پہل بہادر شاہ ظفر نے اس وقت شناخت کی جب وہ کشتیوں کے پل پر سے اپنے گھوڑے پویا دوڑاتے ہوئے آ رہے تھے۔۔۔ دلی والے موسم گرما کے ایک عام دن کے بندھے ہوئے کاموں سے نبٹنے کے لئے جاگ پڑے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں سپاہیوں کے دستے لال قلعے کی فصیلوں تک پہنچ گئے اور بہادر شاہ ظفر سے التجا کی کہ انہیں اندر آنے دیا جائے۔ ظفر نے اس شورش کو پسند نہیں کیا اور سپاہیوں کو داخلے کی اجازت دینے کی بجائے انہوں نے شاہی محل کے پہرہ داروں

کے انگریز کمیدان کیپٹن ڈوگلاس کو طلب کیا۔ سوار آگے بڑھ گئے اور شہر میں دریا گنج کے قریب راج گھاٹ دروازے سے داخل ہو گئے۔۔۔۔ اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اٹھیں، جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا۔۔۔ دہلی نے بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔" (صفحہ 82-81-180)

"1857 سے ایک تاریخی دور کے اختتام کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں مغلوں کی بڑی محنت سے بنائی ہوئی صدیوں پرانی سماجی اور تہذیبی عمارت دھڑام سے گر پڑی۔" (پون کمار ورما، صفحہ 119)

لیکن سوال یہ ہے کہ اس انقلاب سے غالب کا کیا تعلق تھا؟ اور اگر کچھ تھا تو وہ کس حد تک تھا؟ دراصل غالب بغاوت کا پرچم بلند ہونے سے لے کر مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزوں کی حکومت کے باقاعدہ طور پر مسلط ہونے کے چشم دید گواہ تھے۔ اس انقلاب میں ہندوستانیوں کی ناکامیابی دہلی کی تباہی و بربادی اور شرفا کی ذلت و رسوائی نے غالب کو بھی غور وفکر کی دعوت دی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے درست لکھا ہے:

"مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر نے یہ سب کچھ دیکھا ہو اور اس کے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گئے ہوں۔" (الہلال، کلکتہ 17 جون 1914 بہ حوالہ: غالب اور ابوالکلام، عتیق صدیقی، صفحہ 61-59 غالب 1857، 310)

غالب جیسے حساس شاعر کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے اور اس سے بھی زائد یہ کہ اس کی انا کو جب ٹھیس لگتی ہے تو وہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ بکھر جاتا ہے۔ اس کیفیت کا اظہار ان کے کلام، لطیفوں اور خطوط میں جا بجا ہوتا ہے۔

غالب کے خطوط خصوصاً 1857 کے انقلاب کے حوالے سے لکھے گئے خطوط تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب نے شیو نرائن آرام کے نام خط میں لکھا ہے کہ

'ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے جو زندہ ہیں ان میں سینکڑوں گرفتار

بند بلا ہیں۔۔۔۔ جو زندہ ہے اس میں مقدور نہیں۔'' (غالب بہ نام شیونرائن آرام، 19/اپریل 1859ء)

انوار الدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

''لشکروں کا حملہ پے در پے اس شہر (دہلی) پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا، دوسرا لشکر خاکیوں کا اس میں جان و مال ناموس و مکان و مکیں و آسمان و زمیں و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔'' (انوار الدولہ شفق، 1860ء حوالہ غالب اور 1857 صفحہ 228)

غالب نے ایک ایسے دور میں زندگی بسر کی جو تاریخی اعتبار سے ایک پر آشوب دور تھا۔ انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا اور مغلیہ سلطنت محدود ہو گئی تھی۔ مغلیہ شان و شوکت اور دہلوی تہذیب کے شیرازے بکھر رہے تھے۔ شرفا اور امرا کی عزت و ناموس خطرے میں رہا کرتی تھی۔ کب کیا ہو جائے گا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ غالب اسی زمانے میں بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ بہادر شاہ غالب کا قدردان تھا۔ اس نے غالب کو 'نجم الدولہ دبیر الملک' کا خطاب دیا۔ پنشن مقرر کی اور تیموریہ خاندان کی تاریخ لکھنے کی ذمہ داری سونپی۔ غالب نے 'مہر نیم روز' کے نام سے تاریخ کا ایک حصہ مکمل کیا جو 1857ء میں منظر عام پر آیا مگر اس کا دوسرا حصہ جسے انہوں نے 'ماہ نیم ماہ' کا نام دیا تھا، لکھ نہ سکے۔ انقلاب برپا ہو گیا اور وہ دلی جسے میر نے 'عالم میں انتخاب' سے موسوم کیا تھا، انقلاب کی زد میں آ گئی۔ اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ وہ عورتیں جو گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھیں، سڑکوں پر آنے کے لئے مجبور ہو گئیں۔ غالب کی پنشن موقوف ہو گئی۔ ان حالات میں غالب نے اپنی بیوی کے زیورات اور قیمتی اشیا دبا کر رکھ دی تھیں تا کہ موقع پر کام آ سکے۔ لیکن انگریزوں نے انہیں بھی نہیں بخشا اور نکال لے گئے۔ ان ہی دنوں غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کا جو غالب کو بہت عزیز تھے، انتقال ہو گیا۔ غالب انہیں کاندھا نہ دے سکے۔ ان کی چھوٹی بہن خانم کا جوان بیٹا بھی انگریز کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ کتنے ہی دوست، احباب، عزیز و اقارب مارے گئے۔ بعض کو پھانسی دے دی گئی اور بعض دہلی چھوڑ کر چلے گئے۔ صورت حال یہ ہو گئی کہ غم بانٹنے

والے بھی نہ رہے۔ غالب نے یوسف مرزا سے کہا:

'اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہئے۔' (خطوط غالب، صفحہ 403)

تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

'مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے نکالے گئے، جاگیر دار، پنشن دار، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔' (حوالہ ایضاً، صفحہ 238)

غالب کو دلی کی تباہی کا شدید احساس تھا جس کا تذکرہ وہ جا بجا کرتے ہیں۔ 26/دسمبر 1857ء کو غلام نجف خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''انصاف کرو' (خط) 'لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟۔۔۔بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا۔'' (بحوالہ غالب اور انقلاب ستاون، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، صفحہ 239)

لیکن غالب نے وہ سب کچھ لکھا ہے جس کے مطالعے سے ہم اس عہد کے سیاسی، سماجی اقتصادی اور تہذیبی زوال کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ سب ان کے خطوط اور روزنامچہ 'دستنبو' میں محفوظ ہے جسے غالب نے شعوری طور پر لکھا ہے۔ غالب کے ان خطوط کو جو انہوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کے نام لکھے ہیں اگر تاریخی تدریج کے ساتھ ترتیب دیا جائے تو بلا شبہ تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ انگریزوں کا دلی پر قابض ہونا، بہادر شاہ ظفر کی معزولی و بے بسی، قتل و غارت گری، مٹتی ہوئی تہذیب، دلی کی ویرانی، اجڑی ہوئی گلیاں، جلتی ہوئی دکانیں، منہدم عمارتیں۔۔۔ غرضیکہ غالب نے ہر نکتے کو قلم بند کیا ہے۔ ان باتوں کا غالب کو اتنا دکھ تھا کہ دلی کی تباہی اور بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کی خبر سن کر کئی دن تک روتے رہے تھے۔

بہادر شاہ ظفر اور غالب کی شناسائی برسوں سے تھی۔ ظفر کے فرزند بھی غالب کے شاگرد تھے۔ غالب حالانکہ مغل اقتدار کی زوال آمادگی سے بخوبی واقف تھے لیکن ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس کا انجام

اتنا دردناک ہوگا۔ انقلاب کے دوران اور اس کے بعد خود غالب کو بھی بے شمار مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ بہادر شاہ ظفر نہ رہے تو پنشن بھی نہ رہی۔ گھر کا جو اثاثہ، زیور کپڑے کی شکل میں تھا وہ بھی نہ رہا۔ آرام پسند اور ولایتی شراب کے عادی غالب اپنے اہل وعیال کی تکلیف اور خستہ حالی کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ نہ تو دنیا سے متنفر ہوئے اور نہ ہی قنوطی شاعر بنے بلکہ غموں کو بھی بھینچ کر سینے سے لگایا اور زندگی کو برتنے کا سلیقہ سکھایا۔ یہ غالب کے مزاج کا خاصہ تھا۔

غالب کے دوستوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی جس میں مذہب وملت کی بھی کوئی قید نہیں تھی۔ ہر چہرہ شناسا اور ہر گھر میں واقف کار، خوش اسلوب، خوش گفتار، حاضر جواب، شاگردوں کے پسندیدہ استاد، بذلہ سنج، لطیفہ گو اور مقبول ترین شاعر غالب، انقلاب کے بعد اکیلے رہنے پر مجبور ہو گئے اور یہ اکیلا پن انکے لئے سوہان روح بن گیا۔ ان مقتولین میں سے کئی ان کے بچپن کے ساتھی تھے اور شب وروز کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان دوستوں کے چھوٹ جانے سے غالب اپنی زندگی میں خلامحسوس کرنے لگے۔ کبھی کہیں سے کسی دوست کا خط آتا تو غالب کی افسردگی ماضی کے اوراق پلٹنے لگتی۔ 1858ء میں ایک خط لکھتے ہیں:

''وہی بالا خانہ ہے، وہی میں ہوں سیڑھیوں پر نظر کہ میر مہدی آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔''

غالب کی افسردگی کا سبب محض تنہائی نہیں بلکہ ہم مزاج، ہم سخن، ہم زبان اور ہم نوالہ وہم پیالہ دوستوں کی جدائی بھی تھی۔ 1861 میں غالب اپنے دوست کو لکھتے ہیں۔

''اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں، یا پنجابی ہیں، یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟۔۔۔ نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں؟ مومن کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش، نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی۔۔۔۔۔۔''

''میرا حال بہ دستور ہے: نہ نوید کامیابی، نہ نہیب ناامیدی۔'' (تفتہ، 18 جولائی 1858ء)

''یہ شہر، اب شہر نہیں، قہر ہے۔'' (غلام نجف خاں، 18 جولائی 1858ء)

1857ء کا انقلاب، ظاہر ہے کہ آزادی ہندوستان کے حصول کے لئے برپا ہوا تھا۔ گرچہ اس میں کامیابی نہ ملی لیکن راہ ہموار ہوئی۔ اس جنگ میں انگریزوں کی بربریت اور سفاکی کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ ہندوستانیوں میں گرچہ ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے تھے لیکن مسلمانوں پر عتاب کچھ زیادہ ہی نازل ہو رہا تھا۔ ان میں غالب کے دوست، یار، شفیق، شاگرد بھی تھے۔

1857ء کے انقلاب اور تغیرات کے مزاج و مفہوم کو سمجھنے کے لئے یوں تو تاریخی کتابیں بھری پڑی ہیں لیکن تاریخ کے حقائق محدود و مشروط ہوتے ہیں۔ ادب میں تاریخی حالات کا جس طرح سے انعکاس ہوتا ہے وہ تاریخ میں ممکن نہیں۔ غالب کے خطوط ان معنوں میں بے حد اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے ذریعہ اس مخصوص عہد کی دلی، اس کی پامالی، سماجی زندگی پر انقلاب 1857 کے اثرات، مغل اقتدار کے زیر و زبر ہونے کے مناظر غالب کے خطوط میں جس طرح سے نظر آتے ہیں، کہیں اور ممکن نہیں۔۔۔۔ غالب کے خطوط صرف ایک انسان اور ایک شاعر کے ذاتی رنج و غم کا اظہار نہیں بلکہ اس عہد کی المناک و کربناک معاشرتی صورتحال کا منظرنامہ ہے۔ اس سے نبرد آزما ہونے کا اشاریہ بھی اس انسانی اور اخلاقی اقدار کے زوال کا نوحہ بھی۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے خطوط میں جس حقیقت اور بصیرت کے ساتھ اس عہد کی تاریخ بولتی ہے، خود تاریخی کتابوں میں وہ حقیقت اور کیفیت نظر نہیں آتی۔ اسی لئے غالب کے خطوط کی اہمیت ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اور زندگی کے شکستہ آثار کے اعتبار سے بھی۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے خطوط صرف نجی جذبات و احساسات کا اظہار نہیں بلکہ سماجی اور انقلابی زندگی کی معتبر دستاویز بھی ہیں۔

☆☆☆

جاوید رحمانی

ہندوستانی فارسی اور اردو گویوں کا تصور استناد اور غالب کا رویہ

شبلی فارسی کے زبردست عالم تھے۔ ان کی شعرالعجم فارسی ادب کے مطالعے کے سلسلے میں مستند ترین کتاب ہے ان تسامحات کے باوجود جن کی نشاندہی محمود شیرانی نے کی تھی۔ شبلی نے شعرالعجم حصہ دوم میں امیر خسرو کے حالات لکھتے ہوئے حاشیے میں لکھا ہے:

''تمام تاریخی واقعات سے ثابت ہے کہ خسرو ہندوستان زاد ہیں، لیکن والہ داغستانی کو کیوں کر گوارہ ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو۔'' 1

اس سے ظاہر ہے کہ ہندستانی فارسی گویوں کے ساتھ ایرانیوں کے تحقیر آمیز رویے کا شبلی کو احساس تھا اور وہ اس سے نالاں بھی تھے۔ لیکن غیر شعوری طور پر شبلی کا اپنا رویہ بھی ہندوستانی فارسی گویوں کے ساتھ ایرانیوں سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں تھا۔ وہ خیال بندی، مضمون آفرینی اور دقت پسندی وغیرہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس طرز کی ابتدا اور ترقی کے ذمہ دار تو عرفی، ظہوری، جلال، اسیر، طالب اور کلیم وغیرہ ہیں۔ جن کی بدولت یہ طرز مقبول ہو کر دنیائے شاعری پر چھا گیا۔

''اور چونکہ اس طرز کے بے اعتدالی سخت مضر نتائج پیدا کرتی ہے، اس لیے ملک سخن ناصر علی، بیدل وغیرہ کے قبضہ اقتدار میں آگیا اور اس طرح ایک عظیم الشان سلسلہ کا خاتمہ ہوگیا۔'' 2

ناصر علی اور بیدل چونکہ ہندوستانی ہیں اس لئے شبلی کی نظر میں ان کا فارسی پر اجارہ قابل قبول نہیں۔ وہ غالب کی فارسی شاعری کے کسی قدر قائل ہیں لیکن غالب کی بیدل سے اثر پذیری کو پسند نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شاعری کا مذاق جو ناصر علی وغیرہ کی بدولت سیکڑوں برس سے بگڑا چلا آتا تھا، درست

ہو چلا۔ مرزا غالب نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا۔ ابتدا میں وہ بھی بیدل کی پیروی
کی وجہ سے غلط راستہ پر پڑ گئے تھے لیکن عرفی، طالب آملی، نظیری، کلیم کی پیروی نے ان
کو سنبھالا۔۔۔۔ مرزا غالب نے قصیدہ میں متوسطین اور قدماء کی روش اختیار کی،
اگرچہ اکثر قصائد میں متاخرین کی بدعتیں بلکہ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن اخیر اخیر
میں سب کج پیچ نکل گئے اور بالکل اساتذہ کا رنگ آ گیا۔'' 3

یہاں متاخرین سے مراد ہندوستانی فارسی گو ہیں جن کی پیروی کا مطلب شبلی کے لئے بدعتیں اور خامیاں ہیں۔ ان کے لئے غالب اسی وقت تک قابل قبول ہیں جب تک وہ عرفی، طالب آملی، نظیری اور کلیم کی پیروی کرتے رہیں ورنہ تو اور شبلی نے لفظ 'انداز' کے لئے غالب کی سند کو نا قابل قبول لکھا اور کہا کہ وہ اہل زبان نہیں ہیں۔ 4

اوائل 1898ء میں کسی صاحب نے شبلی کو ایک دلچسپ خط لکھا جس میں انہوں نے یہ شکایت کی کہ لوگ عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال اردو میں غلط طریقے سے کر رہے ہیں اور اس طرح بے چاری اردو برباد ہو رہی ہے اور خواہش ظاہر کی ہے کہ اس کے تدارک کے لئے مولانا شبلی جیسے اشخاص کو کوشش کرنی چاہئے۔ اس خط کی بنیاد پر شبلی نے ایک مضمون بعنوان ''املا اور صحت الفاظ'' لکھا۔ اس مضمون میں شبلی ایک طرف تو یہ لکھتے ہیں کہ:

''فارسی زبان میں جب عربی کا اختلاط ہوا تو عربی کے سیکڑوں الفاظ اور جملے شامل
ہو گئے، فارسی کے شعرا اور نثار عموماً علوم عربیہ میں نہایت مہارت رکھتے تھے، لیکن عربی
الفاظ جو انہوں نے برتے، اس قدر غلط برتے کہ آج کم مایہ اردو داں اس سے زیادہ
غلطی نہیں کر سکتے تاہم وہی فارسی آج تک مستند اور فصیح اور شیریں سمجھی جاتی ہے۔ 5

اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ زبان کی ابتدا عوام سے ہوتی ہے اور جب کوئی لفظ کسی خاص شکل میں عوام میں رائج ہو جائے تو خواص بھی اسے اسی شکل میں اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسا کچھ تو اس لئے ہوتا ہے کہ عوام میں رائج صورت کو درست کر کے صحت کے ساتھ بولنا چاہیں تو

یہ نئی صورت جب تک رواج نہ پا جائے عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی اور کچھ اس لئے کہ یہ امر زبان کی عزت اور خود مختاری کی دلیل سمجھی جاتی ہے کہ دوسری زبان کے الفاظ اس میں آئیں تو اسی کے قالب میں ڈھل کر آئیں۔ 6

یہاں شبلی نے جو دوسرا نکتہ بیان کیا ہے وہ انتہائی اہم ہے اور پہلا نکتہ انشا کی دریائے لطافت سے ماخوذ ہے اور عام اصول میں تبدیل ہو چکا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ شبلی کی نظر میں بے چاری اردو اس عزت اور خود مختاری کے قابل نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''فارسی اور اردو پر موقوف نہیں ہر زبان میں دوسری زبان کے الفاظ آکر اصلی حالت پر نہیں رہتے البتہ چوں کہ اردو کوئی مستقل زبان نہیں بلکہ عربی، فارسی، ہندی کا مجموعہ ہے اس لئے اس کو عربی فارسی وغیرہ کے الفاظ پر تصرف کا بہت کم حق حاصل ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے اس بات کا التزام زیادہ موزوں ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ صحیح تلفظ اور ترکیب کے ساتھ قائم رکھے جائیں۔'' 7

حالانکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ 'اساتذہ قدیم و جدید نے عربی و فارسی کے بہت سے الفاظ کو اردو زبان میں غلط طور سے برتا اور آج وہی غلط استعمالات فصیح اور با محاورہ خیال کئے جاتے ہیں۔' اور پھر وہ اسی قاعدے کی بات بھی کرتے ہیں جو انشا نے دریائے لطافت میں پیش کیا تھا اگرچہ انشا کا حوالہ نہیں دیتے لیکن یہ بھی لکھتے ہیں:

''ہمارے محترم بزرگ نے جن الفاظ کا ذکر کیا ہے وہ یقیناً فصحائے اہل زبان کے ہاں مستعمل نہیں ہیں، اس لئے ان کے غلط ہونے میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا، بے شبہہ ایسے الفاظ کو بہت سختی سے روکنا چاہیے ورنہ زبان پر بہت برا اثر پڑے گا، کیونکہ اگر اس قسم کے الفاظ تحریر و تقریر میں کثرت سے پھیل گئے تو ہر شخص کہاں تک یہ تحقیق کرتا پھرے گا کہ ان میں سے کون فصحا کے نزدیک مقبول ہو چکے ہیں اور کون غیر مقبول۔' 8

یہاں پر پہلا سوال تو یہ اٹھتا ہے کہ جب وہ الفاظ تحریر و تقریر میں کثرت سے پھیل جائیں تو فصحا کے

نزدیک مقبول و نامقبول کا سوال ہی کہاں رہ جاتا ہے۔ ان کا استعمال عام ہی ان کے اردو محاورے کا حصہ بن جانے کی سند ہے۔ دوسرا یہ کہ شبلی نے جن الفاظ کو سختی سے روکنے کی بات کہی ہے ان میں منفی جیسا لفظ بھی شامل ہے اور 'منافق' بھی، بہ ایں معنی کہ ان صاحب نے، جن کے خط کی بنیاد پر شبلی نے یہ مضمون لکھا ہے، اپنے خط میں 'منافق' لفظ کے مذہبی سیاق وسباق سے الگ استعمال کو بھی گردن زدنی ٹھہرایا ہے اور اس کی بنیاد پر 'نفاق' کے استعمال سے بھی ناخوش ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ 'بہ جائے نافیہ کے منفی میرے خیال میں غلط ہے۔' اور شبلی صاف لکھ دیتے ہیں کہ ان کے غلط ہونے میں کچھ کلام نہیں ہوسکتا۔

اب دیکھنا یہ چاہیے کہ اردو معاشرے کا آیا کوئی اپنا تصور استناد ہے بھی یا نہیں؟ اور کیا ہم نے شروع سے اردو میں عربی و فارسی الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں یہی رویہ اختیار کیا ہے۔ یا ہم نے اردو کو بھی وہ آزادی دی ہے جس کو ہم بشمول شبلی زبان کی عزت اور خودمختاری کی دلیل سمجھتے ہیں اور ان باتوں کا سراغ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ہندوستانی فارسی گویوں کے رویے کا بھی تجزیہ کریں۔

فارسی زبان کے بارے میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اس نے محمود غزنوی (۹۹۸۔۱۰۳۰ء) کی سرپرستی میں قدم رکھا۔ محمود غزنوی اور اس خاندان کے دوسرے حکمرانوں کے دور حکومت (۱۰۳۰ء۔۱۱۸۶ء) میں لاہور ہندوستان میں فارسی زبان کے ابتدائی مرکز کی حیثیت اختیار کرگیا۔ پھر غوری سلاطین کا دور آیا جس کی اہم خصوصیت صوفیا و مشائخ کا ہندوستان میں ورود ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی اسی زمانے (۱۱۶۱ء) میں ایران سے ہندوستان آئے۔ دہلی، ہندوستان کا سیاسی مرکز مملوک بادشاہوں کے زمانے میں بنی۔ دور آخر کے مملوک بادشاہوں اور خلجی و تغلق حکمرانوں کا دور ہندوستان میں فارسی ادب کا زریں دور ہے۔[9]

یہ امیر خسرو کا عہد ہے جب دہلی کے فارسی گویوں میں امیر خسرو، خواجہ حسن دہلوی، صدرالدین عالی، فخرالدین قواس، حمیدالدین راجہ، مولانا عارف عبدالحکیم اور شہاب الدین وغیرہ پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں اور شبلی نے شعرالعجم میں ان کی اور علاء الدین خلجی کے دربار کے علما و فضلا کی لمبی فہرست تیار کی ہے اور لکھا ہے کہ 'امیر خسرو کے آفتاب کمال نے ان تمام ستاروں کو بے نور کردیا تھا۔'[10]

امیر خسرو ہندوستانی فارسی گویوں میں سب سے زیادہ بااثر سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں ہندوستان ہی نہیں ایران کے باکمالوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ فارسی ادب تین سکوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور خسرو کی شخصیت اتنی ہمہ گیر تھی کہ ان کے بارے میں بالعموم یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان کے 'یہاں سبک خراسانی کا انحطاط، سبک عراقی کا شباب اور سبک ہندی کا آغاز دکھائی دیتا ہے۔'11

ہماری فارسی اور اردو شعریات کی تشکیل میں ان کا رول نہایت اہم ہے۔ اس کی تفصیلی کے لئے میرا مضمون 'امیر خسرو اور اردو شعریات'، قاضی جمال حسین کا مضمون 'دیباچہ غرۃ الکمال کی معنویت' اور دیباچہ غرۃ الکمال (ترجمہ لطیف اللہ) پر شمس الرحمٰن فاروقی کا مقدمہ ملاحظہ فرمائیں۔ خسرو نے دیباچہ غرۃ الکمال میں لکھا ہے۔

> ''وہ صاحب انشا جس نے ہندوستان کے شہروں خصوصاً دہلی میں نشو و نما پائی ہے، اہل انشا کی مستقل ہم نشینی کے بغیر، ہر طریقے پر جو اہل انشا بولتے ہیں بات کہہ سکتا ہے اور سن بھی سکتا ہے اور نظم و نثر میں تصرف کر سکتا ہے۔''12

گویا خسرو کی نظر میں ہندوستانی فارسی گو ایرانی فارسی گویوں کی سند کے محتاج نہیں ہیں اور فارسی پر ان کی حاکمانہ قدرت اس حد تک مسلم ہے کہ وہ فارسی میں تصرف کا بھی حق رکھتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ 'ہندوستان میں کلام فارسی، ساحل سندھ سے بحر محیط کے دہانے تک یکساں ہے۔'13 یعنی فارسی کا معیاری لہجہ جو متعین ہو چکا ہے اس کا بالعموم ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پاس رکھا جاتا ہے۔ یعنی تمام ہندوستان کے فارسی گو اس سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور وہ اس زبان میں تصرف کا بھی حق رکھتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ایران کے ہر خطے کی فارسی کو مستند نہیں سمجھتے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک اس فارسی کا تعلق ہے جو اہل زبان کے واسطے سے (یہاں) پہنچی ہے، سوائے ماوراء النہر کی فارسی کے جو ہندوستان کی فارسی کے موافق ہے، کسی اور خطے کی (فارسی) عبارت درست نہیں ہے۔''14

اس میں دو اہم نکتے ہیں۔ ایک تو یہ کی خسرو کی نظر میں ایران میں صرف ماوراء النہر کی فارسی مستند ہے، دوسرے یہ کہ اس عہد میں ہمارے فارسی گویوں کا اعتماد اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ ہندوستانی فارسی کو ماوراء النہر کی فارسی کے موافق کہنے کے بجائے یہ کہتے ہیں کہ ماوراء النہر کی فارسی ہندوستان کی فارسی کے موافق ہے۔ یعنی ہم ہندوستانی فارسی کی سند ماوراء النہر کی فارسی سے نہیں لیتے بلکہ ماوراء النر کی فارسی کو اس لئے مستند کہتے ہیں کہ وہ ہماری فارسی کے موافق ہے اور اس اعتماد کی فضا ہندوستانی فارسی اور اردو گویوں میں بہت بعد تک ملتی ہے۔ جس کا اندازہ خان آرزو کی 'تنبیہہ الغافلین' اور 'احقاق الحق' جیسی کتابوں سے ہوتا ہے۔ تنبیہہ الغافلین ۱۱۶۱ھ/۴۷-۱۷۴۷ء میں مکمل ہوئی جس میں خان آرزو نے نہ صرف یہ کہ حزیں کی رکیک ہجوؤں کا انتقام لیا جو حزیں نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لئے لکھی تھیں بلکہ حزیں کی فارسی دانی پر بھی سوالیہ نشان قائم کیا۔ 15 اور ان کے یہاں فارسی زبان سے متعلق بے شمار غلطیوں کی نشاندہی بھی کی۔ گویا کہ اس زمانے میں ہندوستانی فارسی گویوں کے لئے کسی کی فارسی صرف اس لئے مستند ٹھہرے کہ وہ ایک ایرانی نے لکھی ہے، ایسا نہیں تھا۔

حزیں نے تمام ہندوستانی فارسی گویوں بشمول ابوالفضل، فیضی، ناصر علی سرہندی اور بیدل پر انتہائی حقارت آمیز تبصرے کئے تھے۔ 'وہ ہندوستانیوں کے بارے میں یہ بھی کہتے تھے کہ یہاں پنج وقتہ نماز کی تعداد کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تو پھر علمی حقائق اور حکمت کے دقایق کا تو کہنا ہی کیا۔ 16

خان آرزو نے حزیں کے اس متکبرانہ رویے کی گرفت کی اور 'تنبیہہ الغافلین' میں خود حزیں کے کلام کی کوتاہیوں پر بھی روشنی ڈالی۔ اس میں شک نہیں کہ خان آرزو کے جواب میں بہت شدت تھی اور انہوں نے حزیں کی کچھ بیجا گرفت بھی کی ہے لیکن ان کے کچھ اعتراضات بالکل درست اور اتنے عالمانہ ہیں کہ ان کو حزیں کے دوست اور ہم وطن والہ داغستانی نے بھی سراہا ہے 17 اور کچھ کی تائید صہبائی نے بھی 'قول فیصل' میں کی ہے جبکہ قول فیصل حزیں کی حمایت میں لکھی گئی تھی۔ 18 خان آرزو کے بعد میر محمد عظیم ثبات نے بھی اپنے والد میر محمد افضل ثابت کے کلام پر حزیں کے اعتراضات کا بدلہ لیا اور حزیں کے تقریباً ۵۰۰ اشعار کی نشاندہی کی، جن کے مضامین متقدمین شعرا سے ماخوذ تھے اور یہ اتنی عمدہ کوشش ہے

کہ والہ داغستانی نے 'ریاض الشعرا' میں لکھا ہے کہ 'اس طرح ثبات نے حزیں کے پانچ سو اشعار کو ضائع کر دیا ہے۔'[19]

اسی طرح فاخر مکیں کی نخوت کا جواب مرزا محمد رفیع سودا (وفات ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) نے دیا۔ سودا نے فاخر مکیں کے اعتراضات اور اصلاحات (جو اشرف علی خاں کی بیاض پر تھے) کی تردید 'عبرت الغافلین' کے نام سے لکھی جس میں خود فاخر مکیں کے کلام پر بھی گرفت کی گئی ہے۔[20] اس سے صاف ظاہر ہے کہ اٹھارہویں صدی تک ہمارے فارسی اور اردو گویوں میں اتنا اعتماد تھا کہ خود فارسی کے سلسلے میں وہ ایرانیوں سے برابری کی سطح پر معاملہ کرنا جانتے تھے اور ایرانیوں کی برتری کے قائل نہیں تھے۔ اس کے برعکس ہمارے غالب جو یہ کہتے ہیں:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی

گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں (۱۸۲۱ء کے بعد)

وہ فارسی کے معاملے میں ایرانیوں کی برتری کو پوری طرح تسلیم کر لیتے ہیں۔ انہوں نے ۱۸۴۷ء یا اس سے کچھ قبل کے ایک خط میں مرزا تفتہ کو لکھا:

''لفظ بے پیر، تورانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے۔ جب میں اشعار اردو میں اپنے شاگردوں کو نہیں باندھنے دیتا تو تم کو شعر فارسی میں کیوں کر اجازت دوں گا؟

مرزا جلال اسیر علیہ الرحمتہ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں، لیکن تعجب اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادۂ ایران ایسا لفظ لکھے۔

''شست بستن'' جب ظہوری کے ہاں ہے تو باندھیے۔ یہ روزمرہ ہے اور ہم روزمرے میں ان کے پیرو ہیں۔ 'بے پیر' ایک لفظ ٹکسال باہر ہے۔ ورنہ صاحب زبان ہونے میں اسیر بھی ظہوری سے کم نہیں۔''[21]

اس خط میں ایرانیوں کی انگلی پکڑ کر چلنے کا غالب کا رویہ اپنے شباب پر ہے۔ اس میں غالب واضح

لفظوں میں یہ کہتے ہیں کہ جس فارسی لفظ یا ترکیب کی سند اہل ایران سے نہیں ملتی اس کا استعمال نہ صرف فارسی بلکہ اردو میں بھی ان کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ غالب کا یہ عقیدہ ہے کہ:

''جو لوگ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے، وہ نظم نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے؟'' 22

تفتہ کو ہی اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں چند الفاظ کے محل استعمال کی وضاحت کرنے کے بعد لکھتے ہیں: 'مگر قتیل اور واقف اور پورب کے ملکیوں کی فارسی' 23

غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فارسی میں یہ الفاظ ان معنوں میں مستعمل نہیں ہیں۔ قتیل اور واقف اور پورب کے ملکیوں کی فارسی میں ہوسکتے ہیں، تو ان کا استعمال سند نہیں۔

صاحب عالم مارہروی کو اپریل ۱۸۵۹ء کو ایک خط لکھا ہے جس میں عبدالواسع ہانسوی اور قتیل اور غیاث الدین کو جلی کٹی سناتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ماعلیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رامپوری نے کھودیا۔۔۔ واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔'' 24

وہ مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس زبان (فارسی) کے قواعد وضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں، جیسے فولاد میں جوہر۔ اہل پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں: ایک تو یہ کہ ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو، دوسو، چارسو، آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں۔'' 25

اسی خط میں 'جو اگست ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا ہے، یہ بھی لکھتے ہیں۔

''مگر جب کہ نظیری شعر میں لایا اور وہ فارسی کا مالک اور عربی کا عالم تھا تو میں نے مانا۔'' 26

اوراسی خط میں یہ بھی لکھتے ہیں:

''سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندوی لوگ جووادی فارسی دانی میں دم مارتے ہیں۔ وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھاگھس، الوعبدالواسع ہانسوی لفظ 'نامراد' کوغلط کہتا ہے اور یہ الو کا پٹھا قتیل 'صفوت کدہ وشفقت کدہ' 'نشتر کدہ' کواور 'ہمہ عالم' 'ہمہ جا' کوغلط کہتا ہے۔''

اور ہندیوں کے قیاس سے غالب کو بیر ہے۔ وہ عبدالغفور سرور کو ایک خط میں فخریہ انداز میں بتاتے ہیں کہ وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سوجگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔ حالانکہ سیالکوٹی مل وارستہ بھی ہندوستانی تھا اس لئے غالب کو یہ بھی لکھنا پڑا کہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے۔ 27؎ لیکن وہ سیالکوٹی مل وارستہ کی 'رجم الشیاطین' سے بہت خوش معلوم ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک ایرانی فارسی داں کی حمایت اور ہندوستانی فارسی داں کی مخالفت کے لئے لکھی گئی ہے۔ حالانکہ اسی سیالکوٹی مل وارستہ کا حشر غالب کے اس خط میں دیکھئے۔ وہ کلب علی خاں بہار کو ایک خط میں ۱۷/اکتوبر ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں:

''میاں انجو جامع فرہنگ جہاں گیری، شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی عظمائے عجم میں سے نہیں، ہندان کا مولد، مآخذ ان کا اشعار قدما، ہادی ان کا، ان کا قیاس، ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ ہندی بھی اور ہندو بھی! نورٌ علیٰ نور!'' 28؎

ہندیوں میں صرف ایک غالب ہیں جنہیں غالب کے خیال میں 'اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے' 29؎ کیونکہ ان کے بقول اکابر پارس میں سے ایک بزرگ وارد ہندوستان ہوا اور اکبرآباد میں غالب کے مکان پر دو برس رہا اور انہوں نے اس سے 'حقائق زبان پارسی' کے معلوم کئے۔ 30؎

حالانکہ قاضی عبدالودود نے ثابت کیا ہے کہ اس بزرگ یعنی ملا عبدالصمد کا وجود فرضی محض ہے۔ وہ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے، میری طرف سے جواب

ہے کہ بندہ ہندی مولد و پارسی زبان ہے۔۔۔زبان دانی فارسی میری ازلی دستگاہ اور یہ
عطیہ خاص من جانب اللہ ہے۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے۔ مشق کا کمال
میں نے استاد سے حاصل کیا ہے۔ ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوش گو اور معنی یاب
ہیں مگر یہ کون کہے گا کہ یہ لوگ دعوی زبان دانی کے باب ہیں۔'' 31

مگر اس بات کو دوسرے ایران پرست فارسی اور اردو والے کہاں تسلیم کریں گے۔ اگر ان کا یہ جواب تسلیم کرلیا جاتا تو شبلی لفظ 'انداز' کے لئے غالب کی سند کو یہ کہہ کر رد نہیں کرتے کہ وہ اہل زبان نہیں ہیں۔32 گویا کہ غالب سے جس طور کا آغاز ہوا اس کا سب سے زیادہ نقصان بھی غالب ہی کو پہنچا۔ غالب کے صرف ایک خط میں ایک ایرانی فارسی گو کے کلام میں ایک 'ہنوز' کو زائد اور بیہودہ کہا گیا ہے۔ یہ خط دسمبر ۱۸۵۲ء میں تفتہ کو لکھا گیا جس میں غالب لکھتے ہیں کہ:

''حزیں کے اس مطلع میں واقع ایک 'ہنوز' زائد اور بیہودہ ہے، متتبع کے واسطے سند نہیں ہو
سکتا۔ یہ غلط محض ہے، یہ سقم ہے، یہ عیب ہے، اس کی کون پیروی کرے گا؟ حزیں تو
آدمی تھا، یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہو تو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔'' 33

اس خط میں غالب کے ہاں وہ اعتماد نظر آتا ہے کہ غلطی چاہے ہندستانی کی ہو یا ایرانی کی، بہر حال غلطی ہے اور اس کی گرفت کرنی چاہیے۔ لیکن حزیں چونکہ ہندوستان آ گئے تھے اس لحاظ سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غالب ایک ایرانی استاد کی نہیں بلکہ اس ایرانی استاد کی مذمت کر رہے ہوں جس کو ہندوستان کی آب و ہوا نے بگاڑا۔ کیونکہ فیضی کے سلسلے میں ان کا کم و بیش رویہ ایسا ہی تھا۔ وہ تفتہ کو ۱۴ر مئی ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''اہل ہند میں سوائے امیر خسرو کے کوئی مسلم الثبوت استاد نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں
کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے، جو اپنے نزدیک صحیح
سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو، ہم اس کو مانیں، ہندیوں
کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں۔'' 34

اس میں فیضی کی زبان پر غالب نے جو اعتراض کیا ہے وہ اسی لئے کہ وہ ہندوستان آئے اور ہند میں آنے کے بعد ان کی زبان غالب کے لئے اس قدر محترم نہیں رہ جاتی جیسی ایرانیوں کی ہے۔ اس سے مجھے لگتا ہے کہ حزیں کی گرفت کی جرأت بھی غالب اس لئے کر سکے کیونکہ وہ ایران کو خیر باد کہہ چکا تھا۔ رہا امیر خسرو کو مسلم الثبوت ماننے کا معاملہ تو اس بارے میں خلیق انجم کی رائے ہے کہ غالب نے معرکہ کلکتہ (جون یا جولائی ۱۸۲۸ء) کے بعد تمام ہندوستانی فارسی گویوں کو غیر مستند کہنا شروع کر دیا۔35 حالانکہ اس سے پہلے ان کی کسی تحریر میں کسی ہندستانی فارسی گو یا فرہنگ نویس کے خلاف ایک لفظ نہیں ملتا اور عبدالقادر بیدل کا تو وہ تتبع ہی کرتے تھے اور فخریہ اس کا اقرار بھی کرتے تھے مگر اس معرکے نے ان کو بیدل سے کنارہ کشی کی طرف مائل کر دیا اور انہوں نے تفتہ کے نام اگست ۱۸۶۲ء کے خط میں ''یہ فارسی بیدل نہ ہے۔''36 کا فقرہ استعمال کیا ہے۔ جبکہ وہ ابتدائے فکر سخن یعنی تقریباً ۱۸۱۲ء میں یہ شعر کہہ چکے تھے۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا اسداللہ خاں قیامت ہے 37

اور ۱۸۱۶ء کی دو غزلوں کے مقطعے یہ ہیں۔38

اسد، ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب عصائے خضر صحرائے سخن ہے، خامہ بیدل کا

۱۸۲۸ء تک غالب بیدل کے اس حد تک قائل تھے کہ اپنی مثنوی بادِ مخالف میں اسی بیدل کی پیروی کی اور انہیں ان ہندوستانی فارسی گویوں سے ممیّز رکھا، جن کی تحریر و تقریر پر غالب کو بھروسہ نہ تھا اور وہ خسرو کے بھی قائل تھے مگر معرکہ کلکتہ نے غالب کو تمام ہندوستانی فارسی گویوں کے ساتھ خسرو اور بیدل سے بھی منحرف کر دیا اور اس معرکے کے بعد ایک (دو) خط اور ایک شعر میں خسرو کی جو تعریف کی ہے وہ صرف اپنے بچاؤ کے لئے۔39 تا کہ ان کے بارے میں یہ نہ کہا جا سکے کہ وہ ایک بھی ہندوستانی فارسی گو کے قائل نہیں ہیں۔ بیدل سے انہوں نے اپنی مکمل برأت کا اظہار ۱۸۵۹ء میں کیا جب عبدالغفور سرور کو یہ لکھا:

''ناصر علی اور بیدل اور غنیمت، ان کی فارسی کیا؟ ہر ایک کا کلام بہ نظر انصاف دیکھئے۔

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ منت اور مکین اور واقف اور قتیل یہ اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجئے۔"40

ناصر علی اور بیدل کو جس طرح ایک ہی سانس میں شبلی رد کرتے ہیں اس سے فوراً غالب کا یہ خط یاد آجاتا ہے اور اگرچہ شعرالعجم ہی میں شبلی یہ بھی لکھتے ہیں کہ فارسی شاعری میں:

"ہندوستان کے اختلاط نے لطافت خیال پیدا کی اور یہی وجہ ہے جو ایرانی شعراء ہندوستانی بن گئے ان کے کلام کی لطافت خالص ایرانی شعراء کے کلام میں مطلق نہیں پائی جاتی۔ نظیری، طالب آملی، کلیم ایران میں کہاں مل سکتے ہیں۔"41

لیکن انہوں نے شعرالعجم میں ہندوستانی فارسی گویوں کو جتنی عزت دی ہے اور جن شرطوں پر دی ہے اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے سلسلے میں شبلی کا ذہن غالب سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے خصوصاً ناصر علی اور بیدل کے معاملے میں تو شبلی باضابطہ غالب کے تربیت یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔

گویا کہ غالب نے ردعمل کے طور پر جو رویہ اختیار کیا وہ شبلی اور نظم طباطبائی تک آتے آتے ہمارے طرز احساس کا حصہ بن گیا اور یہ بالعموم تسلیم کر لیا گیا کہ کوئی بھی ہندوستانی اہل ایران کی ہمسری نہیں کر سکتا اور فارسی میں تصرف تو بڑی بات ہے، کسی فارسی لفظ کو اردو میں بھی کسی ایرانی استاد کی انگلی پکڑ کے ہی استعمال کر سکتا ہے جس کی عبرت ناک مثال نظم طباطبائی کا غالب کے اس مصرعے پر اعتراض ہے۔

سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

ان کا خیال ہے کہ سوا (فارسی) کو بکسرۂ اضافی اس کے ہندی ؍ اردو کی طرف مضاف کرنا غلط ہے۔ حالانکہ 'سوائے اس کے' اب اردو روزمرہ میں داخل ہے۔ کوئی لفظ یا ترکیب غالب کے استعمال کے بعد قبول عام کی سند تو پا جائے لیکن قواعد دانوں کے لئے قابل قبول نہ ٹھہرے۔ یہ نتیجہ ہے اسی منطق کا جس کا سہارا پہلے پہل خود غالب نے اپنے بچاؤ کے لئے لیا تھا۔ اس سے بڑی غالب کی ستم ظریفی اور کیا ہو گی۔ شبلی اور نظم طباطبائی کو غالب یہ سبق تو پڑھا سکتے تھے کہ فارسی ایران والوں کی زبان ہے اور اس میں غیروں کا تصرف نہیں مانا جاتا۔ مگر یہ کیسے باور کرا سکتے ہیں کہ غالب بھی ایرانی ہیں؟ نظم طباطبائی نے اسی

مضمون میں 'غم ناک' سے بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

''اگر کوئی کہے کہ بیدل اور فیضی جو کچھ کہہ جائیں وہ غلط نہیں ہوسکتا، اہل فن اس کو نہیں مانیں گے۔ ان دونوں کی زبان فارسی تھی، متبعین میں تھے، اہل زبان کبھی چشم نم نہیں کہتے، جب کہیں گے نم چشم کہیں گے۔''42

اس سے ظاہر ہے کہ خسرو، خان آرزو، سودا، آزاد بلگرامی، سید سلیمان ندوی اور عبدالستار صدیقی جیسے علماء نے ہندوستانی فارسی اور اردو گویں کے حقوق کی بحالی کے لئے اگر چہ بہت اور عمدہ کوششیں کیں لیکن جیت غالب، صہبائی، شبلی، نظم طباطبائی، نیاز فتحپوری اور شوق نیموی جیسے ایران پرستوں کے رویے کی ہوئی اور اس طرح ہندوستانی فارسی گویوں کا وقار تو کھویا ہی، اردو گو بھی اسی حد تک قابل قبول ٹھہرے جہاں تک ان کی تحریر وتقریر ایرانی فارسی گویوں کے مطابق سمجھی گئی۔ اس طرح کی درجنوں مثالیں شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون ''ایرانی فارسی' ہندوستانی فارسی اور اردو مراتب کا قصہ'' میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ حالانکہ فاروقی نے دیباچہ غرۃ الکمال کے مقدمے میں اس بحث کو غلط رخ پر ڈال دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''فارسی کی حد تک خسرو کو بھی یہ مسئلہ طے کرنا تھا کہ کیا ہندی الاصل شخص کو لسان پارسی میں استادی کا درجہ حاصل ہوسکتا ہے؟ خسرو کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ بھی موج زن تھا۔۔۔۔ لہذا انہیں اس معاملے کا تصفیہ کرنے میں کچھ مشکل نہ ہوئی۔''43

خسرو کے اس بیان کو کہ 'سواد ہند بالخصوص دہلی کے شعرا تمام عالم کے نیک طبعوں سے بہتر ہیں' حب الوطنی کے جذبے سے جوڑنا بنیادی طور پر ویسی ہی بے ایمانی ہے جیسی بے ایمانی ایران کے فارسی گویوں نے ہندوستانی فارسی گویوں کو ساقط الاعتبار ٹھہرا کر کی ہے اور کوئی انتہائی متعصب ایرانی بھی شاید خسرو کے ساتھ اس سے برا سلوک نہیں کرسکتا۔

حواشی:

۱۔ شبلی نعمانی، شعرالعجم حصہ دوم، ۲۰۰۴، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ص:۳-۷

۲۔ شبلی نعمانی، شعرالعجم حصہ دوم، ۲۰۰۲، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ص:۶۴

۳۔ ایضاً، ص ص۔ ۲۳۔۲۴

۴۔ جاوید رحمانی، امیر خسرو اور اردو شعریات، ستمبر ۲۰۰۷، اسلام آباد: ماہنامہ اخبار اردو، ص۔ ۵۱

۵۔ شبلی نعمانی، املا اور صحت الفاظ، مقالات شبلی جلد دوم، ۲۰۰۸، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ص۔۵۹

۶۔ ایضاً ص۔۶۰

۷۔ ایضاً ص۔۶۰

۸۔ ایضاً ص۔۶۰

۹۔ امیر حسن عابدی، فارسی زبان اور ادب کی ترویج و توسیع میں ہندوستان کا حصہ، ہندوستانی فارسی ادب، ۱۹۸۴ء، دہلی: انڈرو پرشین سوسائٹی، ص۔۳۔۱

۱۰۔ شبلی، شعرالعجم، حصہ دوم، ۲۰۰۴، اعظم گڑھ: دالمصنفین شبلی اکیڈمی، ص۔۸۲

۱۱۔ امیر حسن عابدی، امیر خسرو اور سبک ہندی، خسرو شناسی، ۱۹۸۹ء دہلی: ترقی اردو بیورو، ص۔ ۱۹۹

۱۲۔ امیر خسرو، دیباچہ غرۃ الکمال، ترجمہ پروفیسر لطیف اللہ، ۱۴۲۵ھ، کراچی: شہر زاد، ص۔ ۷۸

۱۳۔ ایضاً ص۔۷۹

۱۴۔ ایضاً ص۔۷۸

۱۵۔ جاوید رحمانی، امیر خسرو اور اردو شعریات، ستمبر ۲۰۰۷، اسلام آباد: ماہنامہ اخبار اردو، ص۔۵۰

۱۶۔ شریف حسین قاسمی، فارسی میں ادبی تنقید کی روایت اور تنبیہہ الغافلین، سراج الدین علی خاں آرزو ایک مطالعہ، ۲۰۰۴، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔ ۷۶

۱۷۔ ایضاً ص۔۷۷

۱۸۔ ایضاً ص۔۷۳

۱۹۔ ایضاً ص۔۷۸

۲۰۔ جاوید رحمانی، امیر خسرو اور اردو شعریات، ستمبر ۲۰۰۷، اسلام آباد، ماہنامہ اخبار اردو، ص۔۵۱

۲۱۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط، جلد اول، ۱۹۸۴، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۲۳۴

۲۲۔ ایضاً ص۔۲۳۷

۲۳۔ ایضاً ص۔۲۸۶

۲۴۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط جلد سوم، ۱۹۸۷، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۱۰۱۹

۲۵۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط جلد اول، ۱۹۸۴، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۳۳۵

۲۶۔ ایضاً، ص۔۳۳۵

۲۷۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط جلد سوم، ۱۹۸۵، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۵۹۴۔۵۹۵

۲۸۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط جلد سوم، ۱۹۸۷، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۱۲۳۴

۲۹۔ ایضاً، ص۔۱۲۳۴

۳۰۔ ایضاً، ص۔۱۲۳۴

۳۱۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، ۲۰۰۵، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۳۰۲

۳۲۔ جاوید رحمانی، امیر خسرو اور اردو شعریات، ستمبر ۲۰۰۷، اسلام آباد: ماہنامہ اخبار اردو، ص۔۵۱

۳۳۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط، جلد اول، ۱۹۸۴، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۲۵۰

۳۴۔ ایضاً، ص۔۳۵۲

۳۵۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، ۲۰۰۵، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۲۰۶

۳۶۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط، جلد اول، ۱۹۸۴ء، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۳۳۷

۳۷۔ کالی داس گپتا رضا، دیوان غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے، ۱۹۸۸ء، بمبئی: ساکار پبلشرز پرائیوٹ لمیٹیڈ، ص۔۱۰۹

۳۸۔ ایضاً، ص۔۱۲۰۔۱۱۳

۳۹۔ خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، ۲۰۰۵، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۳۶۴

۴۰۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط جلد دوم، ۱۹۸۵، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔۵۹۴

۴۱۔ شبلی نعمانی، شعرالعجم جلد پنجم، ۲۰۰۲، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ص۔۶۸

۴۲۔ نظم طباطبائی، ادب الکاتب والشاعر، مقالات طباطبائی، ۱۹۸۴، حیدرآباد: الیاس ٹریڈرس، ص۔۲۰۶

۴۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی، مقدمہ دیباچہ غرۃ الکمال (ترجمہ پروفیسر لطیف اللہ) ۱۴۲۵ھ، کراچی: شہرزاد، ص۔۱۷

☆☆☆

ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی

غالب اور عہد غالب: ڈرامہ نگاروں کی نظر میں

غالب اور عہد غالب کا مطالعہ کئی حوالوں سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اب تک ہمارے محققین اور ناقدین کئی حوالوں سے غالب اور عہد غالب کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پیش کر چکے ہیں تاہم یہ سلسلہ جاری و ساری ہے اور مستقبل میں بھی یہ سلسلہ جاری رہنے والا ہے کیونکہ غالب اور عہد غالب ادبی اور تاریخی سطح پر اس قدر اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کا مطالعہ ہمارے لئے ناگزیر ہو گیا ہے۔

بقول پروفیسر محمد حسن:

> ''غالب کی شخصیت جس طرح ایک جھٹکے میں اپنے دور کو اور اپنے دور کی تقریباً سب ہی قابل ذکر شخصیتوں اور اداروں کو (جس میں دہلی کالج بھی شامل ہے) بیک جنبش گھسیٹ لاتی ہے، ویسا کوئی دوسری شخصیت نہیں کرتی، پھر ذرا سلیقے سے غالب کے بارے میں پڑھا تو ایسا لگا کہ بہت سی گتھیاں یاروں نے سلجھائی ہی نہیں اور آج بھی اسی طرح باقی ہیں۔'' (تماشا میرے آگے، دیباچہ غالب اور تھیٹر از زبیر رضوی، ص 12)

محمد حسن کی مذکورہ بالا باتوں کے باوجود غالب اور عہد غالب کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے سب سے پہلے جو سوال ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ کہ آخر ہم اکیسویں صدی کے لوگوں کو انیسویں صدی کا شاعر غالب اتنی شدت سے کیوں یاد آ رہا ہے؟ آخر اس کے عہد میں ایسا کیا تھا کہ جب بھی ہم اس شاعر کی بات کرتے ہیں، اس کا عہد بھی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ نظروں کے سامنے ابھر آتا ہے؟ اسی سے متعلق یہ سوال بھی اہمیت کا حامل ہے کہ کیا غالب ہمیں محض اس لئے یاد آتے ہیں کہ وہ ایک عظیم شاعر اور منفرد نثر نگار تھے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ کسی عہد کا عظیم اور معروف شاعر دوسرے یا تیسرے عہد میں بھی اتنا ہی عظیم معروف رہے کہ جتنا وہ اپنے عہد میں تھا؟ کیا غالب کے عہد میں محض غالب ہی ایک ایسے شاعر تھے جو

عظیم اور معروف تھے؟ یہ سارے سوالات مذکورہ بالا ایک سوال سے ہی جڑے ہوئے ہیں کہ آخر ہمیں غالب اتنی شدت سے کیوں یاد آتے ہیں؟ اور معاف کیجئے گا آج غالب محض اردو والوں کو ہی یاد نہیں آرہے ہیں بلکہ دنیا کی ہر بڑی زبان میں اس وقت غالب شدت سے پڑھے جارہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی افہام وتفہیم کا دائرہ مسلسل وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ نئے نئے گوشے سامنے آرہے ہیں اور غالب کی عظمت میں مزید اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ دراصل ساری بحث معنویت سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ کوئی بھی ادیب وشاعر، مفکر ودانشور اسی وقت شدت سے یاد آتا ہے کہ جب اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

مشینی حکومت کے موجودہ عہد میں جب پوری دنیا بدترین دور سے گزر رہی ہو، حالات ناگفتہ بہ ہوں۔ ہر طرف تاریکی، مایوسی، ناامیدی، گھٹن، لوٹ پاٹ، قتل وغارت گری کا بازار گرم ہو۔ انسانی اقدار پامال کئے جارہے ہوں، تہذیب وثقافت کی نیلامی ہورہی ہو، صارفیت اپنے عروج پر ہو، تو ایسی صورت میں غالب اور عہد غالب کا یاد آنا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کیونکہ غالب کے دور میں بھی پوری انسانیت شکست وریخت سے دوچار تھی جس کا احساس غالب کو بڑی شدت سے ہوا جسے انہوں نے اپنی شاعری اور نثر میں پیش کیا تھا۔ شکست وریخت کا وہ احساس غالب کی شاعری میں تقدیری اور نثر میں ظاہری طور پر اب بھی قائم ودائم ہے جس کے سبب وہ ہمیں شدت سے یاد آرہے ہیں۔

اس مختصر مطالعہ سے معلوم یہ ہوا کہ غالب کی حیثیت ہمارے لیے محض ایک اچھے شاعر کی نہیں ہے بلکہ ایک ضروری شاعر کی سی ہے۔ دراصل یہی وہ ضرورت ہے جو عہد غالب اور عہد حاضر میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے جس کے بطن سے غالب اور کلام غالب کی معنویت پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ غالب کی اس پیدا ہونے والی معنویت کا اعتراف کرنے کے لئے ان کی شاعری، ان کی نثر جس میں ان کے خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ان کے واقعات، ان کے معاصرین اور ان کے ہنگامی دور کے حوالے دینا ضروری ہے تاہم راقم الحروف نے مذکورہ تمام حوالوں سے گریز کرتے ہوئے ایک نیا حوالہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرزا اسداللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ اور ان کے ہنگامی نیز علمی وادبی عہد کو ہمارے ڈرامہ

نگاروں نے کس انداز میں سمجھا، برتا اور پیش کیا ہے۔

غالب اور عہد غالب پر ایک دو نہیں بلکہ درجنوں ڈرامے لکھے اور اسٹیج کئے جا چکے ہیں اور اب بھی اسٹیج کئے جا رہے ہیں۔ فلم، ٹیوی سیریل اور ریڈیائی ڈرامے بھی خوب لکھے گئے ہیں۔ وقت کے پیش نظر یہاں غالب پر لکھے گئے تمام ڈراموں پر بحث ممکن نہیں ہے اس لئے راقم الحروف نے چند معروف ڈراموں پر ہی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

غالب اور عہد غالب کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے ڈرامہ نگاروں کی کوششوں اور کاوشوں کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ بعض ناقدین کے نزدیک ڈرامہ فنون لطیفہ میں شامل ہے اور ڈرامہ میں پیش کی جانے والی باتوں کا حقائق سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس طرح ایک بڑا محقق ایک بڑا نقاد کسی بڑی شخصیت کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے اس کی اور اس کے عہد کی چھوٹی سی چھوٹی باتوں اور چھوٹے سے چھوٹے حالات و واقعات کا باریک بینی سے مطالعہ کرتا ہے تا کہ وہ شخصیت کا حقیقی کردار پیش کر سکے، ٹھیک اسی طرح ایک ڈرامہ نگار بھی اپنے ڈرامے کے ہیرو کا گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے تاکہ وہ ناظرین کے سامنے اپنے ہیرو کا حقیقی کردار پیش کر سکے۔ اس بحث کو یہیں روکتے ہوئے یہ عرض کروں کہ غالب اور عہد غالب پر جن ڈرامہ نگاروں نے طبع آزمائی کی ہے اور غالب کی زندگی، ان کے کارناموں، ان کے حالات و واقعات، ان کے معاصرین اور ان کے عہد کی شکست و ریخت کا جس چابک دستی، ہنرمندی اور فن کارانہ انداز سے جائزہ لیا ہے وہ کسی تحقیقی، تنقیدی اور تاریخی سرمایہ سے کم نہیں ہے۔

ڈی اے ہیریسن قربان نے ''تصویر غالب'' کے عنوان سے ایک مکمل ڈرامہ تحریر کیا ہے جس کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر ولی الحق لکھتے ہیں:

> ''مجموعی حیثیت سے تصویر غالب، غالب کی زندگی پر ایک مفید تصنیف ہے اور اس میں مصنف نے ایمانداری کے ساتھ غالب کی زندگی کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب رہے ہیں۔''

آخر وہ کون سے اسباب ہیں جن کی بنا پر ڈرامہ نگار نے غالب پر ایک مکمل ڈرامہ لکھا ہے اگر یہ بات خود ڈرامہ نگار کی زبانی معلوم کر لی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ ڈی اے ہیر یسن قربان ڈرامہ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''مرزا غالب کی زندگی عام انسانی زندگی کی مکمل تصویر ہے جس میں بچپن کی رنگ رلیاں، شباب کی مستی و بے راہ روی، مصائب زندگی سے ہمدوشی، روزگار زمانہ سے پریشانی، امور خانہ داری کی الجھنیں شاعرانہ فطرت، ظرافت، احباب وشاگردوں سے محبت، تصنیف وتالیف کے مشاغل، ادبی معرکے۔ غرض یہ کہ کونسی 'لَے' ہے جو اس ساز میں مستور نہیں۔''

بقول مرزا:

پر ہوں، میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

عہد حاضر میں ادبی نشستیں تقریباً ناپید سی ہوگئی ہیں اور جو مشاعرے ہو رہے ہیں ان کا انداز وہ نہیں رہا جو میر و غالب کے زمانے میں ہوتا تھا تاہم جس طرح آج کے سنجیدہ شاعروں کو موجودہ صورتحال سے شکایت ہے۔ مرزا غالب کو بھی اپنے عہد سے تقریباً وہی شکایت تھی۔ ڈرامہ نگار نے غالب کے عہد کے بدلتے ادبی مزاج کو ان کی زبانی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایکٹ دوم، منظر چہارم میں مشاعرہ دکھایا گیا ہے۔ اسی سین میں مرزا غالب ایک جگہ کہتے ہیں:

مرزا۔۔ ''اب دلی کی محفلیں اس قابل نہیں رہیں کہ ان میں کوئی شریف آدمی شرکت کرے۔

نیر۔۔۔ ''بے شک حضور''

مرزا۔۔۔ ''یہ مشاعرے اب شریفوں کے نہیں ہیں۔ ایک صاحب ہیں وہ اپنی امت کو لیکر چڑھے آتے ہیں۔ شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں، مفت میں واہ واہ سبحان اللہ۔ سبحان

اللہ۔کا غل مچا کر قیامت برپا کر دیتے ہیں۔''

علائی۔۔۔''حضور یہ مشاعرے کاہے کو ہیں، گروہ بندیاں ہیں۔یہ لوگ اپنے اپنے گروہ کے معمولی معمولی شعروں پر بھی وہ داد دیتے ہیں کہ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔''

ظاہر ہے ڈرامہ نگار نے مرزا غالب، نیّر اور علائی کے مکالموں سے جس صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے وہ انداز صرف ڈرامہ نگار کا ہی ہو سکتا ہے۔اسی طرح ڈرامہ نگار نے زیر مطالعہ ڈرامہ 'تصویر غالب' کے ایکٹ چہارم، منظر پنجم کو ہنگامہ غدر کے طور پیش کیا ہے۔اس میں ڈرامہ نگار نے غالب کی مصلحت پسندی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔غالب کی بیگم جب یہ سوال کرتی ہیں کہ آخر اس ہنگامہ آرائی میں آپ قلعہ جانے کے لئے کیوں سوچ رہے ہیں؟ اس پر غالب نے جو جواب دیا ہے وہ غالب کے ایک مخصوص مزاج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مرزا۔۔۔''بیگم آپ نہیں سمجھتیں۔۔ دیسی سپاہ نے بہادر شاہ ظفر کے شہنشاہ ہندوستان ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔میں نے سوچا خدا معلوم اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اس لئے مصلحتاً قلعہ سے تمام تعلقات منقطع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

ڈرامہ نگار نے اسی منظر میں ہنگامہ غدر کے بعد کی صورت حال غالب کی زبانی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔بیگم کی اس بات پر کہ اللہ اللہ چار دن اور چار ماہ کے اندر اندر کیا انقلاب برپا ہو گیا، غالب کہتے ہیں:

مرزا۔''بیگم۔۔اب یہ ہنگامہ فرو تو ہو گیا مگر دہلی میں عام بد نظمی شروع ہو گئی ہے۔چور لوٹ مار سے امیر بن گئے اور مخمل و ریشم کے بستروں پر استراحت کرنے لگے۔روشن گھروں میں تیل بھی نہ رہا کہ چراغ جلا سکیں۔''

ڈرامہ نگار ہیر یسن قربان نے مرزا غالب کی بد نصیبی، بدحالی، تنگ دستی، ان کی خطوط نویسی، ان کی تصنیفات کا منظر بھی اپنے ڈرامے میں پیش کیا ہے اور کئی اہم واقعات و نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

زبیر رضوی نے 'تماشا میرے آگے' کے عنوان سے غالب پر منتخب اسٹیج ڈرامے کو ترتیب دیا ہے جسے

غالب انسٹی ٹیوٹ نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس میں کنھیا لال کپور کا ڈرامہ غالب جدید شعراء کی مجلس میں، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا ڈرامہ 'دود چراغ محفل'، منجو قمر کا ڈرامہ مرزا غالب، سریندر ورما کا ڈرامہ قید حیات، اظہر افسر کا ڈرامہ غالب چچا، محمد حسن کے ڈرامے کہرے کا چاند اور تماشا اور تماشائی اور سید محمد مہدی کا ڈرامہ غالب کون ہے؟ شامل ہے۔ ''تماشا میرے آگے'' کے پیش لفظ میں معروف ادیب و ناقد پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی غالب کی ہمہ جہت اور رنگا رنگ شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غالب کا فن اور ان کی زندگی ہماری تہذیب کی نہ جانے کتنی سطحوں پر لوگوں کو متاثر کرتی رہی ہے اور ہر فن کے ماہرین نے غالب کو اپنے اپنے طور پر دیکھا، محسوس کیا اور اپنے فن میں انہیں سمونے کی کوشش کی۔۔۔ غالب کو ہمارے یہاں ڈرامے کے بڑے ماہرین نے جب اپنی اپنی نظر سے دیکھا تو گویا کہ غالب خود اپنے جلوؤں کے ہجوم میں طرح طرح سے ہمارے سامنے ظاہر ہوئے اور سبھی نے ان کی زندگی اور شاعری کے ذریعے ایسی سچائیوں کو دریافت کرنے کی کوشش کی جو ان کی ذات، ان کے عہد اور ان کے فن کے بارے میں بے شمار راز افشا کرتی ہیں۔''

مرزا غالب کے سلسلے میں پروفیسر قدوائی کا تبصرہ اس بات کی تائید کر رہا ہے کہ ڈرامہ نگار بھی ایک اچھے محقق اور نقاد کی طرح حقائق کو دریافت کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ مذکورہ بالا ڈراموں میں غالب اور عہد غالب پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے اور ایسے ایسے حالات واقعات اور مناظر سامنے لائے گئے ہیں جو شاید اور کسی تحریر میں نظر نہ آئے ہوں۔

کنھیا لال کپور نے جس طرح دور جدید کے شعراء کی ایک مجلس کا منظر پیش کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔ کیوں کہ اس میں ڈرامہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے دو ادوار کا موازنہ پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں مشاعرہ کا ایک چھوٹا سا منظر پیش خدمت ہے:

''غالب۔۔۔ بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائے گی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر

سنا دیں گے۔

ن م ارشد۔۔۔معاف کیجئے گا مرزا، اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں جائے گی۔شمع کے بجائے یہاں پچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے۔اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔''

مذکورہ بالا مکالمے سے ایک ہی وقت میں ڈرامہ نگار نے دو عہد کے ادب و آداب اور حالات و ماحول کو پیش کر دیا ہے۔غالب کے عہد میں مشاعرہ کے آغاز کے بعد کوئی شاعر اسی وقت اپنا کلام پیش کرتا تھا جب اس کے سامنے شمع رکھ دی جائے لیکن عہد حاضر میں یہ روایت ختم ہوگئی کیونکہ یہ دور، دور برقیات ہے جہاں شمع کی بجائے بجلی کے بلب روشن ہیں۔

ڈرامہ نگار منجو قمر نے ڈرامہ مرزا غالب کا آغاز غالب کے ایک مقبول ترین شعر سے کیا:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ڈرامہ نگار نے مذکورہ بالا شعر کا انتخاب کر کے غالب کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔اسی ڈرامے میں ڈرامہ نگار نے مرزا غالب کے خطوط کا سہارا لیتے ہوئے ان ہی کی زبانی روزہ سے متعلق ان کے خیالات پیش کیے ہیں۔

''مرزا۔۔۔ایسے ہی سوال پر جو کہتا ہوں۔روزہ رکھتا ہوں مگر روزہ کو بہلائے رکھتا ہوں۔کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا لیکن لوگ عجب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں۔میں تو روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور لوگ فرماتے ہیں کہ روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات۔''

ایک جگہ اور مرزا غالب کے اس واقعہ کو منظر بنا کر پیش کیا گیا ہے جب انگریز افسر کرنل براؤن مرزا سے سوال کرتا ہے کہ کیا تم مسلمان ہو، مرزا غالب جواب دیتے ہیں آدھا مسلمان ہوں۔غالب کے اس جواب پر انگریز چونک جاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ آدھا مسلمان کا کیا مطلب ہے؟ جس پر غالب جواب دیتے ہیں:

پوچھا کیا مطلب، میں نے کہا شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا۔

سید محمد مہدی کا ڈرامہ 'غالب کون ہے؟' بھی قابل ذکر ہے کیونکہ اس ڈرامہ میں اس غالب کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہر کسی کو نظر نہیں آتا۔ ڈرامہ نگار نے غالب کی انسان دوستی کا ذکر کر کے غالب کی عظمت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ غالب، شیفتہ اور تفتہ کے مکالمے ملاحظہ ہوں:

شیفتہ: مگر قبلہ میں تو شراب سے توبہ کر چکا ہوں۔

غالب: یعنی اس سردی میں بھی؟ مگر یہ توبہ کیونکر نواب صاحب۔

شیفتہ: سنا نہیں مرزا صاحب آپ نے کہ شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

غالب: بھائی شیفتہ تم بھی کیا بات کرتے ہو۔ جسے روز ایک بوتل اولڈ ٹام کی مل جایا کرے اسے دعا مانگنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

تفتہ: یہی سب باتیں ہیں قبلہ کہ کوئی کہتا ہے آپ فری میسن ہو گئے، کوئی کہتا ہے کافر ہو گئے اور جانتا کوئی نہیں کہ آپ ہیں کیا۔

غالب: میں انسان کو چاہے وہ مسلمان ہو یا ہندو یا عیسائی عزیز رکھتا ہوں۔ یہی میرا عقیدہ ہے چاہے کوئی مانے یا مانے۔

غالب کے نزدیک شاعری کی اہمیت وافادیت کیا ہے اور اچھی شاعری کے لئے کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کا احوال ڈرامہ نگار نے خود غالب کی زبانی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غالب۔۔۔ ہم نے طریقہ چھوڑا ہے نہ چھوڑنے کا ارادہ ہے۔ لوگ جو کہتے ہیں کہا کریں۔ میں شاعری کو معنی آفرینی سمجھتا ہوں قافیہ پیمائی نہیں۔ شعر کہنے کے لئے پہلے دل کو شیشے کی طرح غم کی آنچ میں پگھلانا پڑتا ہے۔ پھر اسے عقل کے سانچے میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ نظر بھی چاہئے جو پتھروں کے سینے میں چھپے ہوئے بت ناچتے دیکھ سکے اور لفظ ایسے نئے کہ ان کے منہ سے دودھ کی بو آئے۔ غالب کی قدر اگر آج

نہیں تو کل اس کے مرنے کے بعد ہوگی۔ اس میں جو شک کرے وہ کافر۔''

غالب نے اپنے خطوط میں اپنی بدحالی، بے کسی، مجبوری و لاچاری، ناقدری، قرض سے ڈوبی زندگی کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا ہے۔ کوئی بھی غالب کی زندگی کے بارے میں جاننے کے لئے ان کے خطوط پڑھ سکتا ہے لیکن ڈرامہ نگار نے مذکورہ باتوں کو جس انداز میں پیش کیا ہے اور جس احساس کی شدت میں ڈوبے مکالمے خود غالب کی زبان سے ادا کرائے ہیں وہ اور کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔

غالب ۔۔۔ شاعر! اب تو آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج اور ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک جوتی اور لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ بڑا شاعر ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرض خواہوں کو جواب دے۔ (اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ٹہلنے لگتے ہیں۔)

مغلوں کے زوال کے احوال بھی ڈرامہ نگار نے غالب کی زبانی بڑے کم لفظوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجروح جب غالب سے پوچھتے ہیں کہ آخر قلعہ سے آنے میں اتنی تاخیر کیوں ہوگئی کیا کوئی خاص تقریب تھی جس پر غالب جواب دیتے ہیں:

غالب ۔۔۔ بڑی مشکل ہے مجروح۔ ہر شہزادہ شاعر ہو گیا ہے، ان کی مہمل غزلوں کی اصلاح کرو اور پھر تعریف بھی کہ واہ سبحان اللہ کیا شعر کہا ہے۔ اس سے نجات ملے تو مصاحبوں کی غزلیں دیکھو اور قلعہ کے قصے سنو۔ اجی سنا مرزا صاحب آپ نے؟ فلاں شہزادے صاحب فلاں شخص کی لڑکی اٹھالائے۔ فلاں شہزادے بٹیر بازی میں اتنا ہار گیئے۔

ڈرامہ نگاروں نے غالب کے گھر کے احوال بھی بیان کے ہیں اور غالب اور ان کی بیگم کے درمیان جو تو تو میں میں ہوتی تھی اس کو خوبصورت زبان دی ہے اور ظاہر ہے ڈرامہ نگاروں کو یہ انداز خود غالب سے حاصل ہوا ہے۔ اس سلسلہ کا ایک منظر اور ملاحظہ کریں پھر آپ کی زحمت تمام:

بیگم ۔۔۔ توبہ توبہ اس وقت بھی کمرے میں کم بخت اسی حرام شے کی بو بسی ہوئی ہے۔

غالب ۔۔ میں نے کب کہا تھا کہ تم یہاں آؤ۔تم نے میرے کھانے پینے کے برتن تک تو الگ کردئے، اب کیا گھر چھوڑ کر چلا جاؤں۔

بیگم ۔۔۔ گھر گھر۔ بڑا اچھا گھر ہی لیا ہے آپ نے۔ مینہ ایک گھڑی برستا ہے تو چھت ایک گھنٹہ برستی ہے۔ساری زندگی شاید کرایہ کے مکان میں ہی گزرے گی۔ مجھے تو اس مکان سے خوف آتا ہے۔ پڑوس والے کہہ رہے تھے کہ یہاں کوئی بلا رہتی ہے۔

غالب ۔۔ تو آپ سے بڑھ کر کوئی اور بلا ہو سکتی ہے۔

غالب ۔۔ یہ نہیں دیکھتیں کہ اس وقت کام کر رہا ہوں۔

بیگم ۔۔۔ کیا خاک کام کر رہے تھے۔ کام کرتے تو گھر کا یہ حال ہوتا؟ میں ہی جانتی ہوں جو مجھ پر گزرتی ہے، کتنی جانوں کی پرورش کرنی پڑی ہے۔کلّو، کلیان، وفادار، بہشتی، نائی، دھوبی، کہارن کے بیوی بچے۔ میں آدمیوں کو روٹی کہاں سے دوں اور اب عارف مرحوم کے بچوں کا بھی بوجھ ہے۔لیکن تمہارے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ شام ہوئی اور شراب میں ڈوبے۔

غرض یہ کہ ڈرامہ میں ہمارے ڈرامہ نگاروں نے بھی اپنی کوششوں، تحقیقی اور تنقیدی نظروں سے غالب اور عہد غالب کے وہ وہ واقعات اور غالب کی شاعری اور ان کے انداز بیان کے وہ وہ نکات تلاش کئے ہیں جو غالب اور عہد غالب کی مزید افہام وتفہیم میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ آخر میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ غالب پر لکھے گئے ڈرامے اردو ادب کے سرمایہ میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں جنہیں فراموش کرنا ممکن نہیں۔

☆☆☆

مزار غالب پر جسٹس جاوید اقبال کی حاضری

1977ء میں علامہ اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے سلسلے میں مجھے دوبار پاکستان سے باہر جانا پڑا۔ پہلی مرتبہ امریکن انسٹی ٹیوٹ فار پاکستان اسٹڈیز اور برکلے یونیورسٹی کی جنوب ایشیا کی فیکلٹی کے اقبال سے متعلق سیمینار میں شرکت کے لئے میں نیویارک اور واشنگٹن گیا۔ اس سیمینار کا اہتمام ڈاکٹر حفیظ ملک نے کیا تھا۔ سیمینار سے فراغت کے بعد میں نے چند ہفتے ان کے ساتھ ان کی یونیورسٹی والانووا (پان سلوینیا) میں گزارے۔

دوسری مرتبہ میں اور میری بیوی ناصرہ پاکستان ہائی کمیشن کی دعوت پر علامہ اقبال سے متعلق تقریب میں شرکت کے لئے دہلی گئے۔ تقسیم کے بعد میں پہلی مرتبہ (تیس برس بعد) بھارت گیا تھا۔ دہلی کی تقریب میں اندرا گاندھی اور واجپائی بڑے تپاک سے ملے۔ علاوہ ان کے بھارت میں اقبال شناسوں یعنی جگن ناتھ آزاد، گوپی چند نارنگ، آل احمد سرور، علی سردار جعفری، اسلوب احمد انصاری وغیرہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں واجپائی بھارت کے وزیر خارجہ تھے، اندرا گاندھی اپوزیشن لیڈر تھیں اور مرار جی ڈیسائی وزیر اعظم تھے (واجپائی پاکستان بھی تشریف لائے تھے اور جنرل ضیاء الحق کو بھارت میں بنی علامہ اقبال پر فلم پیش کی تھی) میں نے اندرا گاندھی سے کہا کہ جب اگلی مرتبہ لاہور تشریف لائیں تو ہمارے یہاں ٹھہریں۔ انہوں نے قریب کھڑے واجپائی کی طرف دیکھ کر طنزاً کہا کہ پہلے ان سے میرا پاسپورٹ واپس دلوایئے۔

ہم نظام الدین اولیاء گئے اور خواجہ حسن ثانی نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ وہاں موجود قوالوں نے جب علامہ اقبال کی نظم ۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی	کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے	جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رُوسیاہی

سنائی تو میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں نے نظام الدین اولیاء کی تربت پر بھارت اور پاکستان کے درمیان مستقل امن اور دوستی کی دعا کی۔ بعد ازاں غالب کے مزار کی زیارت کی اور ان کے ایصال ثواب کے لئے دعا کی۔

(جسٹس جاوید اقبال کی خودنوشت سوانح حیات 'اپنا گریباں چاک' سے ماخوذ۔)

بشکریہ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی

☆☆☆
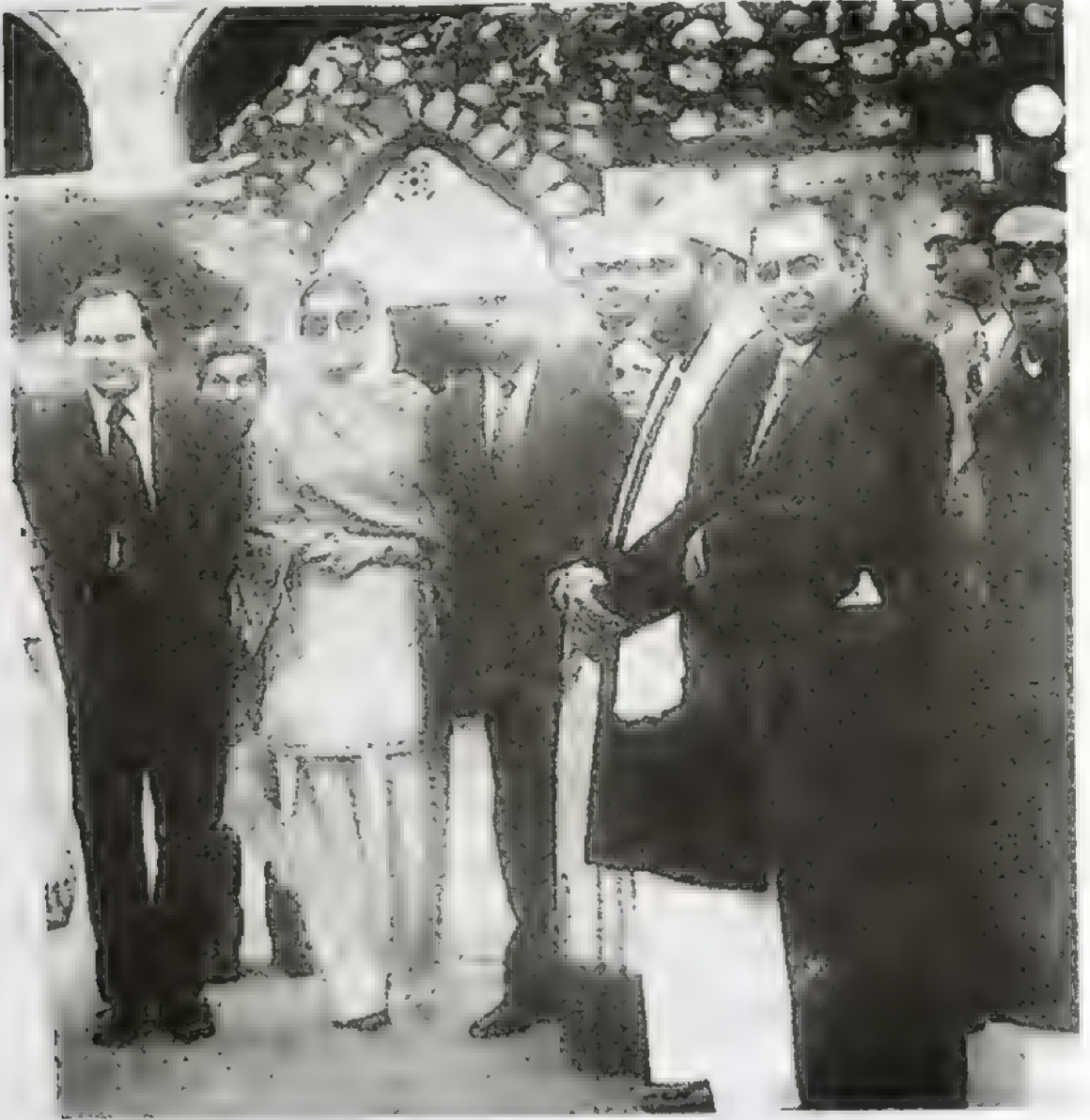
جسٹس جاوید اقبال، خواجہ حسن ثانی نظامی و دیگر ادیبوں کے ساتھ۔

کتابوں کی باتیں

کتاب کا نام : آسان ہندی اردو لغت

مرتب : عبدالمجید

ناشر : نوشین مجید، یکہتہ، کھٹونا، مدھوبنی

اشاعت : 2009

صفحات : 160

قیمت : -/100روپے

زیر تبصرہ کتاب ' آسان ہندی اردو لغت' اردو ڈائرکٹوریٹ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ (راج بھاشا) حکومت بہار کے جزوی مالی تعاون سے شائع شدہ، ان الفاظ کا مجموعہ ہے جن الفاظ کا ہندی زبان سے اردو ترجمہ کرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کتاب بائیں ہاتھ سے ہندی رسم الخط کے 'چھوٹے آ' سے شروع کی گئی ہے۔ کتاب میں ان تمام الفاظ کو یکجا کر کے مختصر لغت کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جو عام طور پر مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ، آکاشوانی اور دوردرشن کے ترجمہ نگاری کے کاموں کو جلد اور صحیح طریقہ سے نپٹانے میں کافی معاون ثابت ہوں گے۔

☆☆☆

کتاب کا نام : مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عصر حاضر

مرتب : محمد ہارون

ناشر : مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن 2009، ٹی پی اسٹریٹ ممبئی

قیمت : -/250روپے

مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی ایک مشن کے طور پر مولانا کے علمی و ادبی ورثہ کو عام کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے۔ چنانچہ اب تک کئی عمدہ کتابیں اس سلسلے میں شائع کر چکی ہے۔ زیر نظر کتاب مارچ 2008ء میں جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ میں منعقد سیمینار میں پڑھے گئے 19 مقالات کا مجموعہ ہے۔ مولانا ہمارے ان دانشوروں میں بلند پایہ مقام کے حامل ہیں جن کی نگاہ مشرقی علوم و ادبیات پر بہت گہری اور معتبر تھی۔ مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے مضامین میں ان کی ناقدانہ نظر، ادبی شعور، تفسیر، تصوف اور تدبر قرآن وغیرہ جیسے متعدد پہلوؤں کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ مشمولہ مضامین میں دو مضمون ''مولانا عبدالسلام ندوی کی خدمت اقدس میں گذارے ہوئے چند ماہ و سال'' اور ''مولانا عبدالسلام ندوی اور ہم'' ان کی شخصیت اور سیرت سے متعلق ہیں۔ یہ دونوں مضامین خوب ہیں اور معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

امید ہے کہ علمی و ادبی ذوق رکھنے والے قارئین اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

☆☆☆

کتاب کا نام : کاغذی ہے پیرہن

شاعر : ابرار کرت پوری

ناشر : مرکز علم ودانش، نئی دہلی-25

قیمت : -/150 روپے

ابرار کرت پوری اردو کے کہنہ مشق استاد شاعر ہیں۔ ان کی پہچان نعت اور حمد سے ہے۔ انہوں نے 'حمد و نعت اکیڈمی' بھی بنائی۔ ان کے کئی مجموعے حمد و نعت کے مثلاً مدحت، ورفعنا لک ذکرک، خالق ذوالجلال خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے خاص رنگ سے جدا غزلوں کا مجموعہ ہے اور وہ غزلیں جو بطور خاص غالب کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ مجموعے میں 151 غزلیں شامل ہیں۔ حمد و نعت گو شاعر کی غزلوں سے بھی بلند خیالی اور پاکیزگی کا اظہار ہوتا ہے۔ فہرست میں غالب کی غزلوں کے مصرعے دیے ہوئے ہیں۔ انہیں مصرعوں پر شاعر نے اپنی غزلیں کہی ہیں۔ مجموعے کی ابتدا غالب کی

زمین میں نعتیہ اشعار سے ہوتی ہے۔

فکر میں الفاظ کا جب مخزن گوہر کھلا مدحت سرکار میں اشعار کا دفتر کھلا

ابرار کرت پوری صاحب نے غالب کی زمینوں میں جو غزلیں کہی ہیں ان میں عصر حاضر کی تازگی کی جھلک ملتی ہے۔ پہلی غزل کا ایک شعر نئی تہذیب کے حوالے سے۔

الاماں تہذیب نو تو نے حیا بھی چھین لی حیف اے تخریب دم گھٹنے لگا تعمیر کا

کتاب اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے۔ کاغذ بھی مناسب ہے۔

☆☆☆

کتاب کا نام : سرگذشت دہلی

مرتبہ : ڈاکٹر درخشاں تاجور

ناشر : رضا لائبریری، رام پور

پہلا ایڈیشن : 2007

قیمت : -/350 روپے

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی 1857ء پر بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اس موضوع پر انگریزوں نے بھی کتابیں لکھی ہیں، انقلابیوں سے ہمدردی رکھنے والوں نے بھی اور انگریزوں سے قربت رکھنے والے ہندوستانیوں نے بھی۔ پہلی جنگ آزادی کی صد سالہ اور 150 ویں سالگرہ کے موقع پر بہت کتابیں منظر عام پر آئیں۔ 150 ویں سالگرہ کے موقع پر رضا لائبریری رام پور نے اپنے مخطوطات کے ذخیرے میں سے جیون لال کا روز نامچہ چھاپنے کا فیصلہ کیا اور اسے ترتیب کے لئے ڈاکٹر درخشاں تاجور کے سپرد کیا۔ ڈاکٹر درخشاں تاجور کا اصل موضوع تاریخ آزادی ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے کئی کتابیں تصنیف وتالیف کیں۔

جیون لال، بہادر شاہ ظفر کے معتمد خاص تھے۔ ان کا تعلق انگریزوں سے بھی تھا۔ قلعے کی خبریں وہ انگریزوں تک خفیہ طور پر پہنچاتے تھے۔ اپنے روز نامچے میں جیون لال نے 11 رمئی 1857ء سے لے

کر 14 ستمبر 1857ء تک قلعے کے احوال اور انقلابیوں کے منصوبے اور سرگرمیوں کا حال دلی کے جوائنٹ مجسٹریٹ کی خدمت میں لکھ کر پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ جیون لال کا اصل مقصد آزادی کے متوالوں کی تعریف وتوصیف بیان کرنا نہیں تھا بلکہ مخبری کے طور پر ان کی خبریں انگریزوں تک پہنچانا تھا۔ اس لئے انہوں نے انقلابیوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی ذکر کیا اور قلعے کے تفصیلی حالات سے بھی مٹکاف کو آگاہ کیا۔ اس طرح سے جیون لال کے روزنامچے میں آنکھوں دیکھا حال بیان کیا گیا ہے۔ اسے ڈاکٹر درخشاں تاجور نے بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے اور اس روزنامچے کو اصل ماخذ اور دستاویزی صورت حاصل ہے۔ اس روزنامچے کے ساتھ ڈاکٹر درخشاں تاجور نے روزنامچے کے ساتھ حواشی اور اشاریہ کا اضافہ کیا۔ حواشی میں پہلی جنگ آزادی کے تعلق سے معروف اور غیر معروف اشخاص کا تعارف پیش کیا اور مزید مطالعے کے کتابوں کے حوالے بھی دئے۔ اشارے میں موضوع سے متعلق اہم ماخذ کی فہرست بھی دی ہے۔ کتاب کے آخر میں اہم اشخاص اور مقامات کی فہرست دی گئی ہے جس میں نام کے ساتھ کتاب کا اشاریہ کے تحت صفحہ دیا گیا ہے۔ اشخاص یا مقامات کی تفصیل دئے گئے صفحے پر آسانی سے دیکھی جاسکتی ہے۔ کتاب کو ترتیب دینے میں ڈاکٹر درخشاں تاجور نے جدید تحقیق کے اصول وضوابط کو ملحوظ رکھا ہے۔ 1857ء کے تعلق سے یہ کتاب نہ صرف اصل ماخذ کا درجہ رکھتی ہے بلکہ اس موضوع پر بے شمار مواد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

☆☆☆

نام رسالہ　:　ادبی گزٹ، عالمی اردو مجلّہ (۱)

مدیر　:　ڈاکٹر م نسیم اعظمی

ناشر　:　عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ کساری، مؤناتھ بھنجن۔ 275101

زرِتعاون　:　-/150 روپے

362 صفحے کے اس مجلّے میں مختلف مقامات کے قلم کاروں کی نمائندگی دے کر عالمی مجلّہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ 208 صفحے پر مشتمل 25 مضامین، 87 صفحات پر منظومات اور 63 صفحے افسانے

کے لئے مختص کئے گئے ہیں۔ اداریے میں ڈاکٹر نسیم نے ادبی گزٹ کی اشاعت کا ایک نکاتی بنیادی مقصد واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''نئی نسل کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا ہوگا اور ان کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی بھی کرنی ہوگی تب ہی زبان وادب میں نئے ادراک وآگہی اور وجدان وشعور کی نئی شمعیں روشن ہوسکیں گی اور چراغ سے چراغ جلانے کی علمی، ادبی اور تخلیقی روایات کے تسلسل کو قائم رکھنے میں کامیابی حاصل ہوسکے گی۔'' ادبی گزٹ کے پہلے شمارے سے ایسا لگتا ہے کہ م۔نسیم کا یہ قدم قابل مبارکباد ہے لیکن اسے جاری وساری رکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ رسالے کو نئی نسل کے تخلیق کاروں کے ساتھ نئی نسل میں اردو قاری بھی پیدا کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام انفرادی نہیں ہے اگر عالمی سطح پر اردو سکھانے کا کام شروع کیا گیا تو یقیناً خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے۔ توقع ہے کہ م۔نسیم صاحب نے جن دشواریوں کا ذکر اپنے اداریہ میں کیا ہے اگلے شمارے میں اس میں کمی واقع ہوگی اور ادبی گزٹ میں مزید بہتری پیدا ہوگی۔
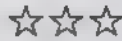
شاداب حسین

ادبی سرگرمیاں

مرزا غالب کے 212ویں یوم ولادت کے موقع پر پروگرام کا انعقاد کیا گیا

مرزا غالب کے 212ویں یوم ولادت کے موقع پر 27ردسمبر 2009 کو ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں فنکار انیس اعظمی نے غالب کے خطوط کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا۔

9رجنوری 2010 کو غالب اکیڈمی میں ''لیکچر''

غالب اکیڈمی کی طرف سے 9رجنوری 2010 کو 'غالب اور انسانیت'' کے موضوع پر کیلی فورنیا کی بیگم حمیدہ بانو کے ایک لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ اپنے خطاب میں حمیدہ بانو نے مختلف اشعار اور خطوط کی روشنی میں غالب کے جذبۂ انسانیت اور انسانی اقدار کے فروغ کے لئے ان کی فکری کاوشوں کو بیان کیا۔ جلسے کی صدارت جناب جوگندر پال نے کی۔

20رفروری 2010 کو غالب اکیڈمی میں 'غالب اور غالب کا عہد' پر سیمینار کا انعقاد کیا گیا

غالب اکیڈمی کے یوم تاسیس اور مرزا غالب کے یوم وفات کے سلسلے میں سہ روزہ پروگرام 20رفروری تا 22رفروری 2010 کا انعقاد کیا گیا۔ 20رفروری 2010 کو غالب اور غالب کا عہد پر سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ غالب کا عہد مستقل مطالعہ کا درجہ رکھتا ہے۔ غالب کا زمانہ ایک عجیب وغریب زمانہ ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس عہد نے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ غالب نئے مستقبل کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس عہد میں مشرق ومغرب کا تصادم، افکار ونظریات کا تصادم، اسالیب کا تصادم نظر آتا ہے۔ اسی زمانے میں حقیقت پسندی اور فطرت پسندی کی اصطلاح عام

ہوئی۔فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج قائم ہوا۔حالی نے نئی غزلیں کہیں۔پوری روایت پر نظر ڈالی۔ایک طرف یہ کشمکش تھی کہ انگریزوں کے ہمنوا پیدا کیے جائیں اور دوسری طرف ماضی کی روایت کو برتنے کی کشمکش تھی۔بے یقینی میں نئے دور، نئے فطری نظام کی تشکیل کا دور تھا۔

سیمینار کے پہلے اجلاس میں جناب وسیم احمد سعید نے 'مولانا فضل حق خیر آبادی' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ڈاکٹر ارجمند آرا نے 'غالب کا ایک ممتاز اسکالر اور مترجم۔رالف رسل' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔پروفیسر قاضی افضال حسین نے 'واقعہ کی تاریخ سازی، 1857 کے حوالے سے' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔پروفیسر عبدالحق نے 'غالب کے ایک ممدوح معاصر۔شاہ غمگین گوالیاری' کے حوالے سے مقالہ پڑھا۔پہلے اجلاس کی صدارت خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے اور نظامت ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی نے کی۔

سیمینار کے دوسرے اجلاس میں ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی نے 'غالب اور عہد غالب، ڈرامہ نگاروں کی نظر میں'، جناب جاوید رحمانی نے 'ہندوستانی فارسی اور اردو گویوں کا تصور استناد اور غالب کا رویہ'، ڈاکٹر یونس جعفری نے 'میرزا صائب و غالب دہلوی' اور پروفیسر قاضی جمال حسین نے 'غالب کی روش خاص اور سادہ بیانی کا مسئلہ' کے عنوانات سے مقالے پیش کیے۔دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی افضال حسین نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر ابوبکر عباد نے انجام دیے۔

21رفروری 2010 کو غالب اکیڈمی میں 'محفل کلام غالب' کا انعقاد کیا گیا

21رفروری 2010 کو غالب اکیڈمی میں محفل کلام غالب کا انعقاد کیا گیا جس میں استاد اقبال احمد خاں، ڈاکٹر انیس احمد خاں، ارونا جائسوال، زبیر عالم نظامی اور امریکہ کی ڈاکٹر راجی نے موسیقی کے ساتھ غالب کی غزلیں پیش کر کے سامعین کو مسحور کیا۔اس پروگرام کو بے حد پسند کیا گیا۔

22رفروری 2010 کو غالب اکیڈمی میں 'طرحی مشاعرہ' کا انعقاد کیا گیا

22رفروری 2010 کو غالب اکیڈمی میں طرحی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔جس کی صدارت کہنہ مشق

شاعر وقار مانوی نے کی جبکہ معروف صحافی اور کالم نگار فاروق ارگلی نے اپنے خاص لب ولہجہ میں نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جس میں غالب کے تین مصرعہ ہائے طرحہ میں دہلی اور بیرونی دہلی کے مشہور و معروف شعراء نے مطروحہ غزلیں پیش کیں۔ پیش ہیں کچھ منتخب اشعار۔

مصرعہ ہائے طرحہ: (1)۔ نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز، (2)۔ دست تہہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے، (3)۔ غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی

منتخب اشعار:

ایسے دنیا سے بے نیاز کیا	اے غم دوست تیری عمر دراز	وقار مانوی
غرض ہوتے ہیں خود ہی مبتلائے امتحاں اکثر	وہ کوشش تو بہت کرتے ہیں مجھ کو آزمانے کی	ابرار کرت پوری
راز اس نے ہی سارے کھول دئے	جس کو ہم نے بنایا تھا ہمراز	اسد رضا
بکھر کر کرچیاں میری مجھی پر مسکراتی ہیں	کوئی دیکھے تو کیفیت مرے آئینہ خانے کی	شہپر رسول
کروں تعظیم دشمن کی یہ آساں تو نہیں لیکن	طریقت صوفیوں کی ہے یہی رب کو منانے کی	نرل سنگھ نرل
جھوم اٹھے گا شعور زمزمہ ساز	کبھی خاموشیوں کی سن آواز	نسیم عباسی
تمنا تو بہت تھی ان کو حال دل سنانے کی	نہ دی فرصت غم دنیا نے لیکن سر اٹھانے کی	تابش مہدی
میں تو اس بحث میں نہیں پڑتا	کون کوتاہ قد ہے کون دراز	کمال جعفری
میں تیری چاہتوں میں خاک ہو کر رہ گئی لیکن	تو اب بھی بات کرتا ہے ستارے توڑ لانے کی	انا دہلوی
کیا ایسی ملاقات سے حاصل ہو مسرت	ظاہر ہی نہ ہو جس سے وفا ہے کہ جفا ہے	فصیح اکمل
کچھ تو ہی بتا حسن یہ جو تیری عطا ہے	یہ ہجر وفاؤں کی سزا ہے کہ جزا ہے	شہباز ندیم ضیائی
کیا شوق نظارہ پہ عجب وقت پڑا ہے	دیکھیں تو خطا اس کو نہ دیکھیں تو سزا ہے	معین شاداب
یہاں پھر سر اٹھانے کی سزا مل جائے گی ہم کو	غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی	متین امروہوی
اظہار محبت بھی ترا زہر بجھا ہے	جب جان پہ بن آئی تو احساس ہوا ہے	ظفر مرادآبادی
مسرت اور خوشی سے واسطہ کچھ بھی نہیں ہم کو	بفیض غم ہمیں عادت ہوئی ہے مسکرانے کی	سکندر عاقل
تاریخ مرے عصر کی محفوظ رہے گی	غزلوں میں مری، عہد مرا بول رہا ہے	قمر سنبھلی
نگر میں جب سے بچے رہ گئے اور گاؤں میں دادی	لگائے کون پھر آواز پریوں کو بلانے کی	ممتا کرن
جو اہل نظر ہیں یہ انہیں خوب پتا ہے	لفظوں کے تبسم میں مرا درد چھپا ہے	سلمیٰ شاہین

شیشۂ دل چیخ گیا جو کبھی — کر سکے گا نہ کچھ بھی آئینہ ساز — تقی شیرکوٹی

امیر شہر تجھ کو تیری زرداری مبارک ہو — مری غیرت نہیں دیتی اجازت سر جھکانے کی — شریف شہباز

روشنی دربدر بھٹکتی ہے — اور اندھیروں کو ملتا ہے اعزاز — ایس یوظفر

روح پرور ہے اس کا غمزہ و ناز — شخصیت اس کی ہے کرشمہ ساز — احمد علی برقی

وقت کی اک ہلکی ٹھوکر سے — ٹکڑے ٹکڑے ہوا ہے شیشۂ ناز — سلطان الحق شہیدی

تعبیر اسی خواب کی میں ڈھونڈ رہا ہوں — جو رات کے ماتھے پہ چراغوں نے بُنا ہے — جاوید مشیری

لو اب ضد چھوڑ دی میں نے تمہیں اپنا بنانے کی — قسم کھائی ہے لیکن عمر بھر رشتہ نبھانے کی — فرمان چودھری

کچھ پیاس تو سوکھی ہوئی مٹی کی بجھے گی — کچھ کام تو آجائے گا جو اشک گرا ہے — یٰس پرویز

اب ہم ہی کو لڑنی ہے اندھیروں سے لڑائی — سورج تو خود اپنا ہی لہو چاٹ رہا ہے — شاہد انجم

فضائیں راس آجائیں اگر ہم کو زمانے کی — تو ہم بھی سوچتے پتھر کو آئینہ بنانے کی — ولی اللہ ولی

خیالوں نے بھی انگاروں کی بارش کی شبِ فرقت — کوئی حد بھی تو ہو اے دوست تیرے یاد آنے کی — شمس رمزی

اب امن و سکوں ہے نہ کوئی جشن نیا ہے — اس دور کی تقدیر میں بس کرب و بلا ہے — سلیم صدیقی

میں ہوں اردو کا عاشق جاں باز — ہو اجازت تو بانٹ لوں کچھ راز — رؤف رامش

ایک ہی صف میں کافر و مومن — پڑھ رہے ہیں خدائے زر کی نماز — فاروق ارگلی

خبر سنتے تو ہیں اس سنگ دل کے دل میں آنے کی — خدا معلوم کیا صورت بنے آئینہ خانے کی — احمد محفوظ

20/مارچ 2010 کو غالب اکیڈمی اسٹڈی سرکل کی جانب سے استقبالیہ

غالب اکیڈمی اسٹڈی سرکل کی جانب سے 20/مارچ 2010 کو فرانسیسی نژاد اردو کے ناول نگار ژولیان کے سلسلے میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا۔ استقبالیہ تقریب کی صدارت جناب جوگندر پال نے کی۔ اس موقع پر ژولیان نے اپنے ناول کے کچھ اقتباسات پیش کیے۔ اکیڈمی کے صدر پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے مہمان کو چند کتابوں کا تحفہ پیش کیا۔ اس پروگرام میں جناب سید اوصاف علی، وسیم احمد سعید، نگار عظیم اور دیگر ادیبوں نے شرکت کی۔

☆☆☆

غالب اکیڈمی میں IGNOU کے اردو اسپیشل اسٹڈی سینٹر کا قیام

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے اسکول آف ہیومنٹیز نے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں متوقع اپنے چالیس اردو اسٹڈی سینٹروں کے کونسلروں کی شرکت سے دو روزہ اورینٹیشن پروگرام 21 رمئی 2010 کو مکمل کیا۔ اگنو کے وائس چانسلر پروفیسر راج شیکھرن پلّے نے کونسلروں کو یقین دلایا کہ اردو پروگراموں کے لئے یونیورسٹی ہر طرح کا تعاون دے گی۔ اسکول آف ہیومنٹیز کی ڈائریکٹر انگریزی کی سینئر پروفیسر رینو بھاردواج نے پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور مندوبین سے اگنو کے اردو پروگراموں کے فروغ و اشاعت کی درخواست کی۔ ریجنل اسٹڈی سینٹر کے نمائندے نے اردو اسٹڈی سینٹر کی ذمہ داریوں سے کونسلروں کو واقف کرایا۔ پروفیسر نصیر احمد خاں، سینئر صلاح کار اور پروگرام کوآرڈی نیٹر نے اردو کے سرٹی فکیٹ اور ڈپلومہ پروگراموں کی تفصیل بتاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ یہ ہمارے انٹی گریٹڈ پروگرام کا وہ حصہ ہیں جو اردو میں بی۔اے۔ (آنرز) کرنے کے بعد مکمل ہوتا ہے۔ دہلی میں ان فاصلاتی کورسیز کا سینٹر غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں قائم کیا گیا ہے۔

کورس	تعلیمی لیاقت
۱۔ اردو سرٹی فکیٹ کورس مدت (چھ ماہ)	کسی طرح کی کوئی قید نہیں۔
۲۔ اردو ڈپلومہ کورس مدت (ایک سال)	اگنو کا اردو سرٹی فکیٹ کورس یا اردو کے ساتھ ہائی اسکول یا اس کے مساوی مدرسے کی سند۔
۳۔ بی۔اے۔ (جنوری 2011ء سیشن)	اگنو کا ڈپلومہ کورس یا اردو کے ساتھ سینئر سیکنڈری پاس یا اس کے مساوی مدرسے کی سند۔

فارم اور پروسپیکٹس ملنے کا مقام

غالب اکیڈمی

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی ''اسپیشل اسٹڈی سینٹر''

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔110013

☆☆☆

مطبوعات غالب اکیڈمی

نام کتاب	مصنف/مترجم	قیمت
دیوانِ غالب (ہندی)		100/-
دیوانِ غالب عام ایڈیشن	غالب اکیڈمی	60/-
غالب شناس مالک رام	گیان چند جین	90/-
دیوان غالب ڈیلکس		150/-
شرح دیوان غالب اردو	قاضی سعید الدین علیگ	250/-
اقبال کی منتخب نظمیں غزلیں تنقیدی مطالعہ	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	150/-
تفتہ اور غالب	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	35/-
شرح دیوان غالب (ہندی)	نسیم احمد عباسی	550/-
غالب اور فن تنقید	اخلاق حسین عارف	25/-
تصورات غالب	محمد عزیز حسن	35/-
انشائے مومن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	25/-
مومن شخصیت اور فن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	300/-
ہندوستانی رنگ	پروفیسر محمد حسن	75/-
نوائے سروش (انگریزی)	غالب اکیڈمی	40/-
اقبال/مضامین مقالات	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	95/-
جنوب مغرب ایشیا میں رابطے کی زبان	پروفیسر محمد حسن	75/-
رقص شرر	انّ میری شمل (قاضی افضال حسین)	90/-
اردو غزل کے اہم موڑ	شمس الرحمان فاروقی	150/-
تلمیحات غالب	محمود نیازی	90/-
جہات غالب	ڈاکٹر عقیل احمد	200/-
حکیم عبدالحمید شخصیت اور خدمات	ڈاکٹر عقیل احمد	150/-
مطالعات خطوط غالب	حکیم عبدالحمید	150/-
مطالعات کلام غالب	حکیم عبدالحمید	600/-